پاکستانی ادب کے معمار



سید وقار عظیم: شخصیت اور فن

اصغر ندیم سید

اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی ادب کے معمار

(سلسلہ ۱۴۸)

پروفیسر سید وقار عظیم: شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

پروفیسر سید وقار عظیم: شخصیت اور فن

ڈاکٹر اصغر ندیم سید



اکادمی ادبیات پاکستان

پطرس بخاری روڈ، سیکٹر H-8/1، اسلام آباد

نگران اعلیٰ	:	ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو
منتظم	:	ڈاکٹر راشد حمید
نگران منصوبہ و طباعت	:	اختر رضا سلیمی
مصنف	:	ڈاکٹر اصغر ندیم سید
نظر ثانی	:	ڈاکٹر صلاح الدین درویش
اشاعت اول	:	2017ء
تعداد	:	1000
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	:	نسٹ پریس، اسلام آباد
قیمت	:	مجلد: -/220 روپے
		غیر مجلد: -/200 روپے

ISBN: 978-969-472-316-7

فہرست

پیش نامہ

پاکستانی ادب کے معمار کے سلسلے کی کتابوں کا بنیادی مقصد، جہاں ایک طرف پاکستانی زبانوں کے اہم لکھنے والوں کی خدمات کا اعتراف کرنا اور انھیں عام قارئین تک پہنچانا ہے، وہیں ادب کے محققین، ناقدین اور اردو ادب کے طالب علموں کو ان کے متعلق بنیادی نوعیت کا تحقیقی و تنقیدی مواد فراہم کرنا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے کی تمام کتابوں کی نوعیت تعارفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک حد تک تحقیقی و تنقیدی بھی ہے۔

سید وقار عظیم: شخصیت اور فن، اس سلسلے کی ۱۲۸ویں کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ سید وقار عظیم کا شمار ان نابغہ روزگار شخصیتوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے اردو کے ادبی سرمائے کو تحقیقی اور تنقیدی طور پر ثروت مند بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اردو کے کلاسیکی نثری سرمائے بالخصوص داستانوں اور ڈراموں پر ان کا کام آج بھی بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ سید وقار عظیم نے بہت سی درسی کتابیں بھی لکھیں جن میں سے کئی آج بھی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔

اس کتاب کے مصنف اصغر ندیم سید کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ بطور ایک شاعر، ڈرامہ نگار کالم نگار اور ادبی محقق کے ان کی حیثیت مسلمہ ہے۔ سید وقار عظیم پر ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ آج بھی ایک بنیادی حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کی درخواست پر انھوں نے یہ کتاب بہت محنت، لگن اور محبت سے لکھی ہے۔ یوں تو تحقیق اور تنقید جان جوکھوں ہی کا کام ہے لیکن ایک ایسی شخصیت پر اس حوالے سے قلم اٹھانا، جس کا کام بہت وقیع اور وسیع ہو، خاصا دشوار ہوتا ہے لیکن ان تمام کٹھنائیوں سے وہ جس سہولت سے گزرے وہ ہمارے لیے باعثِ افتخار ہے،

جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

مجھے ذاتی طور پر خوشی ہو رہی ہے کہ اس نابغہ روزگار شخصیت پر یہ کتاب میری وساطت سے منظر عام پر آ رہی ہے۔

اس کتاب کی تدوین، تزئین و آرائش اور طباعت کے لیے میں اپنے رفیق کار اختر رضا سلیمی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کو حسب سابق یہ کاوش بھی پسند آئے گی۔ آپ کی رائے کا ہمیں انتظار رہے گا۔

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو

عجزِ بیاں

پروفیسر سید وقار عظیم پر میرا تحقیقی اور تنقیدی کام بنیادی طور پر میرے پی۔ایچ۔ڈی مقالے سے تعلق رکھتا ہے۔جب اختر وقار عظیم نے مجھے میرا فرض یاد دلایا تو میں نے پہلا بہانہ یہ بنایا کہ میں اپنے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے کو سنگِ میل پبلی کیشنز سے چھپوانا چاہتا ہوں، جن سے میرا خاندانی رشتہ پچھلے چالیس سال سے قائم ہے۔نیاز احمد صاحب میری فیملی کے سرپرست ہیں۔اختر بھائی نے سہولت پیدا کر دی کہ کچھ اپنے تھیسس سے فائدہ حاصل کرو اور کچھ نیا لکھو اور اکادمی ادبیات کی مشہور سیریز ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے لیے سید وقار عظیم کی شخصیت اور فن پر مکمل معلومات اور تنقیدی تجزیہ اپنے حساب سے تخلیق کرو۔اختر وقار عظیم سے بھی تعلق سال دو سال کا نہیں ہے۔ساتھ میں اطہر وقار عظیم اور انور وقار عظیم سے بھی رشتہ کوئی کل کی بات نہیں ہے۔جو محبت مجھے ان بھائیوں سے ملی ہے اُس کی ایک ایک نشانی اور ایک ایک لمحہ مجھے یاد ہے۔اب جب کہ میرا یہ کام اکادمی ادبیات کی سیریز ''پاکستانی ادب کے معمار'' میں شامل ہو رہا ہے۔تو میرے لیے اطمینان' مسرت اور اعزاز کی بات ہے۔اس کام کے لیے مجھے جس شخصیت نے چنا تھا، وہ ڈاکٹر سید معین الرحمان تھے، جو سید وقار عظیم کا ہی عکس تھے۔اُستاد شاگرد کے تعلق کی کئی مثالیں پہلے بھی تھیں لیکن یہ مثال تو بے مثال ہے۔اُستاد کو چھپاؤ تو شاگرد اور شاگرد کو چھپاؤ تو اُستاد کا گمان گذرے۔اب میری خوش قسمتی کہ ڈاکٹر سید معین الرحمان کا شاگرد نہ ہوتے ہوئے بھی میں ہی آخر میں اُن کا وہ شاگرد ٹھہرا جو اس کام کے لیے اُن کے اعتبار پر پورا اُتر سکتا تھا یا پھر وہ مجھ پر ایسا احسان کرنا چاہتے تھے جو میری تدریسی زندگی میں ایک اہم سنگِ میل ثابت ہو رہا ہے۔میں گورنمنٹ کالج لاہور میں 1986 میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے شعبہ اُردو کا حصہ بنا تو میری خوش قسمتی کہ

ڈاکٹر سید معین الرحمان کی سربراہی میں ایک بیحد کامیاب تدریسی سفر کا آغاز ہوا۔ میں نے مکمل Academic Freedom سے گورنمنٹ کالج لاہور کی عظیم روایات کا حصہ بننے کی کوشش کی۔ معین صاحب نے مجھے ''مجلس اقبال'' کی ذمہ داری سونپی جو میں نے جی۔سی یونیورسٹی میں اپنے قیام تک بخوبی نبھانے کی کوشش کی۔

معین صاحب نے میری صلاحیتوں پر بھروسہ کرتے ہوئے مجھے ایم۔اے کلاس پڑھانے کے لیے منتخب کیا اور ''افسانوی ادب'' کا پرچہ میرے سپرد کیا۔ مجھے یاد ہے اُردو افسانے پر اور اُردو ڈرامے پر پروفیسر سید وقار عظیم کے انتہائی تخلیقی اور وقیع تنقیدی کام نے مجھے بہت انسپائر کیا خاص طور پر ''انارکلی'' پر جو معلومات ان کی تخلیقی مزاج کی حامل تنقید نے مجھے دیں اور ان تحریروں نے جس طرح میری تربیت کی وہ بحیثیت اُستاد ہمیشہ میرے کام آتی رہیں گی۔

پروفیسر سید وقار عظیم کی شخصیت اور تہذیبی مزاج کا پرتو میں نے ڈاکٹر سید معین الرحمان میں دیکھا۔ وہی اخلاقی قدریں، وہی رکھ رکھاؤ، وہی ملائم اور دھیما اندازِ گفتگو، وہی مشاورت کا پہلو، وہی دوسروں کی مدد کے لیے خندہ پیشانی سے پیشکش کرنے کا اُصول۔ گویا ہر لحاظ سے سید معین الرحمان اعلیٰ انسانی قدروں کے حامل شخصیت کے مالک تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اُن کے مجھ پر بے شمار ذاتی احسانات ہیں۔ 1986 سے 2000 تک کا عرصہ میری ڈرامہ نگاری کا بے حد مصروف زمانہ ہے۔ مجھے اس حوالے سے ملکی اور غیر ملکی سفر درپیش تھے۔ گورنمنٹ کالج میں کوئی اُستاد اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے مجھے اپنے فرائضِ منصبی اور بحیثیت ڈرامہ نگار مصروفیات میں ایک توازن پیدا کرنا تھا۔ اگر سید معین الرحمان میری مدد نہ کرتے تو شاید میں ڈرامہ نگاری کو جاری نہ رکھ پاتا۔

مجھے یاد ہے مئی 2000 میں جب میری بیگم کا اچانک حادثاتی طور پر انتقال ہوا تو میں برطانیہ میں تھا۔ میری غیر موجودگی میں معین صاحب اور ان کے صاحبزادے وقار معین میرے گھر پہنچ کر تعزیت کے لیے آنے والوں کی بھرپور میزبانی میں مصروف ہو گئے۔ پھر جب میں نے ڈیفنس میں پلاٹ لیا تھا تو اُس کی ادائیگی سانده روڈ کے گھر کو بیچ کر ہی ممکن تھی۔ لیکن مسئلہ یہ آن

پڑا کہ ڈیفنس کا پلاٹ فوری خریدنا تھا اور سانده روڈ کے گھر کی فروخت کا عمل قدرے بعد میں ہونا تھا۔ ایسے میں چار لاکھ کم ہو رہے تھے جو معین صاحب نے فوراً ادا کیے اور میں نے پلاٹ لے لیا۔ جب میرا گھر بک گیا تو میں نے معین صاحب کا قرض چکایا۔ ایسے بے شمار واقعات ہیں جب انھوں نے خاموشی سے اپنے رفقائے کار کی مدد کی۔

جب سید معین الرحمان کی ریٹائرمنٹ کا وقت آیا تو میں خود کو بہت تنہا محسوس کر رہا تھا اور اُداس بھی تھا۔ معین صاحب نے اپنے آفس میں بلایا اور ایک خط پڑھوایا جو انھوں نے وائس چانسلر خالد آفتاب کے نام لکھا تھا۔ جس میں دلائل کے ساتھ یہ سفارش کی تھی کہ مجھے صدرِ شعبہ بنایا جائے۔ میں نے مشورہ دیا کہ آپ یہ نہ بھیجیں یہ درخواست قبول نہیں ہو گی۔ معین صاحب نے کہا میں اپنا فرض پورا کر رہا ہوں۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے اندازہ تھا۔ خیر یہ بھی اچھا ہوا کہ میں یہ ذمہ داری پوری نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی ملازمت کے آخری دن معین صاحب نے مجھے بلایا اور ایک فائل تھمائی، جس میں سید وقار عظیم کی شخصیت سوانح اور علمی و ادبی کاموں سے متعلق نادر تحقیقی دستاویزات اور تصاویر تھیں۔ معین صاحب نے بتایا کہ انھوں نے سید وقار عظیم کی ادبی خدمات اور تخلیقی اور تحقیقی کاموں سے متعلق ہر طرح کی تحریر سنبھال کر رکھی ہوئی ہے، جس سے میں استفادہ کر سکتا ہوں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنی لائبریری کے دروازے میرے لیے کھول دیے اور حکم دیا کہ میں اپنا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ سید وقار عظیم کے تخلیقی اور تحقیقی کام پر مکمل کروں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ان کی مدد سے میں اُن کے خواب کی تکمیل کر سکا۔ یقیناً اُن کی روح آسودہ ہو گی اور ان کے درجات بلند ہوں گے۔

آج اس کتاب کی شکل میں سید معین الرحمان کی خواہش مکمل ہو رہی ہے۔ میں اُن کے لیے دعا گو رہوں گا۔ جو کوتاہی رہ گئی ہے اُس کا ذمہ دار صرف میں ہوں۔

ڈاکٹر اے بی اشرف صاحب کا میں بے حد ممنون ہوں جنھوں نے بہت محبت سے اس کتاب کا تعارفیہ تحریر فرمایا۔

اصغر ندیم سیّد

تعارفیہ

1961-1963 کا سیشن تھا جب میں نے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے شعبۂ اُردو میں ایم۔اے کے لیے داخلہ لیا۔میرے اساتذہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر ناظر حسن زیدی جیسے نامی گرامی علما شامل تھے مگر میری خوش نصیبی کہ مجھے سب سے زیادہ اپنے اُستادِ گرامی پروفیسر سید وقار عظیم کی خصوصی توجہ اور شفقت حاصل رہی ۔میں نے ایم۔اے کے لیے اپنا مقالہ ''آغا حشر اوراُن کا فن'' بھی انھی کی رہنمائی میں مکمل کیا۔ایم۔اے کرنے کے بعد تدریس کا پیشہ اختیار کیا اور پچاس سال تک مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دینے کے بعد اور کئی ایک تحقیقی اور تنقیدی کتابیں تصنیف وتالیف کرنے کے بعد اب بیاسی سال کی عمر میں اپنے اساتذہ اور احباب کے خاکے لکھنے کا شوق چرایا تو بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ میں نے اپنے محبوب اُستاد پروفیسر وقار عظیم پر بھی ایک مضمون (خاکہ) قلم بند کیا جو شاہد علی خاں کے ماہنامہ ''الحمرا'' میں شائع ہوا۔

جون کے مہینے میں انقرہ کی ایک خوشگوار شام کو میں اپنے فلیٹ میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ میرے موبائل کی گھنٹی بجی اور بڑی باوقار، گمبھیر مگر دل پذیر اور دل نشین آواز آئی:

''اشرف صاحب! میں اسلام آباد سے اختر وقار عظیم بول رہا ہوں۔آپ کا فون نمبر بڑی مشکل سے ملا۔بابا جان پر آپ کا مضمون پڑھا۔آپ نے بڑی محبت سے لکھا ہے۔کاش یہ چند روز پہلے آجاتا تو میری مرتّب کردہ کتاب ''پدرم سلطان بود'' میں شامل ہوجاتا۔''

میں نے کہا: ''کاش ایسا ہوتا مگر اب کیا ہوسکتا ہے۔بہر حال آپ کی آواز سُن کر بے حد خوشی ہوئی ہے کہ میرے مثالی اُستاد کی آواز سے ملتی جُلتی آواز نے آج سے کم وبیش پچاس سال پہلے کی خوشگوار یادوں سے ایک بار پھر میرے دل ودماغ کو روشن کردیا ہے۔اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں، میں نے

اپنے اُستادِ محترم کی بے پناہ شفقتوں، مہربانیوں اور احسانوں کے بدلے ان کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ یہ میرے دل کی آواز ہے۔ مگر مجھے واقعی بڑا افسوس ہے کہ یہ مضمون آپ کی کتاب میں شامل نہ ہو سکا۔''

اختر صاحب نے فرمایا:

''چلیے اب یوں کیجیے کہ ڈاکٹر اصغر ندیم سید نے ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے عنوان سے وقار صاحب کی شخصیت اور فن پر مقالہ لکھا ہے جو چھپنے جا رہا ہے، اُس کا تعارفیہ اور مقدمہ لکھ دیجیے اور یہ خاکہ بھی اُس میں شامل کر دیجیے۔''

میں نے عرض کیا: ''یہ تو میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ میں دو چار روز بعد اپنے شہر ملتان جا رہا ہوں، گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے۔ آپ مجھے مسودہ وہاں بھجوا دیجیے۔''

چناں چہ میں عید سے دو روز پیشتر ملتان پہنچا۔ عید سے چند روز بعد مجھے مسودہ مل گیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ میرے عزیز اصغر ندیم سید نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لی تھی لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ انھوں نے میرے اُستادِ محترم کی شخصیت اور خدمات پر تحقیقی مقالہ قلم بند کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے چناں چہ یہ انکشاف میرے لیے خوشی کا باعث بنا۔

یہ 1967 کی بات ہے کہ میں بہاول نگر ڈگری کالج میں چار سال کا عرصہ گزارنے کے بعد ایمرسن کالج ملتان میں تبدیل ہو کر آیا تو مجھے انٹر، بی۔ اے اور ایم۔ اے کی کلاسیں تدریس کے لیے دی گئیں۔ بی۔ اے کے سالِ اوّل میں اُردو الیکٹیو پڑھنے والے چند طلبہ میں ایک نہایت مؤدّب، سانولا سلونا، سمارٹ اور اپنے تجسّس بھرے سوالوں سے متوجہ کر لینے والا نوجوان اصغر ندیم سید میرا پسندیدہ شاگرد بن گیا۔ اُس وقت تک مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اِس نوعمر ذہین و فطین شاگرد کی میرے ساتھ ایک اور نسبت بھی ہے اور وہ یہ کہ اُن کے والدِ گرامی اور میرے ''بابا'' کے درمیان گہری دوستی کا رشتہ قائم تھا۔

بی۔ اے کے بعد اصغر ندیم سید کو ایم۔ اے اُردو کرنے کا مشورہ میں نے دیا اور انھوں نے اِسے مان لیا۔ اُن کے ہم جماعتوں میں معروف و مقبول شاعر محسن نقوی بھی تھے۔ چناں چہ دونوں دوست میرے بہت قریب آ گئے۔ محسن نقوی تو ایم۔ اے کرنے کے بعد سیاست اور بزنس میں آ گئے جب کہ اصغر ندیم سید نے معلّمی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ پبلک سروس کمیشن سے پہلی ہی مرتبہ منتخب ہو کر ایمرسن کالج میں وہ میرے رفیقِ کار بن گئے۔ اب اُن کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوئیں۔ انھوں نے ادبی محفلوں میں

بولنا شروع کیا ۔ایم ۔اے کے طلبہ و طالبات کو عالمانہ لیکچر دینے لگے ۔تنقیدی مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا، تیسری دُنیا کی محکوم اور مظلوم اقوام کے شاعروں کی نظموں کا اُردو میں منظوم (بلینک ورس میں) ترجمہ کیا (زمین زاد کا افق)، خوبصورت نظمیں اور غزلیں تخلیق کیں اور معیاری افسانے لکھے۔

پھر ایسا ہوا کہ کوڑوں اور لٹھوں والی سرکار نے اُن کے نا کردہ گناہوں کی سزا کے طور پر اُنھیں ہم سے جدا کر کے ''شرق پور'' کالج بھجوا دیا اور وہاں سے خوش قسمتی نے اُنھیں گورنمنٹ کالج لاہور پہنچا دیا۔ یہاں سے اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کا ایک اور پہلو سامنے آیا اور انھوں نے ٹیلی وژن ڈرامے لکھنے شروع کیے اور صف اوّل کے ڈراما نگار ٹھہرے ۔بطور ڈراما نگار ان کی شہرت کی خوشبو محض مُلکی سطح پر نہیں بین الاقوامی سطح پر پھیل گئی۔

میرے اُستادِ گرامی پروفیسر سید وقار عظیم کی شخصیت اور علمی و ادبی خدمات پر مقالہ لکھ کر انھوں نے اپنی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا بھی لوہا منوایا ہے ۔حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر اصغر ندیم سید نے اپنے اس مقالے میں نہ صرف اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے بلکہ میرے اُستادِ محترم کی شخصیت اور علمی و ادبی خدمات کو ایک تخلیقی اسلوبِ نگارش کے ساتھ نمایاں کیا ہے ۔اگر چہ یہ کتاب ان کے پی ۔ایچ ۔ڈی کے مقالے کا جزوی حصہ بلکہ ''استفادہ'' ہے مگر اپنی منفرد نوعیت کے لحاظ سے نہایت وقیع اور مکمل تصنیف بن گئی ہے۔

ڈاکٹر اصغر ندیم سید نے اپنی اس کتاب کا انتساب ڈاکٹر معین الرحمٰن مرحوم کے نام کیا ہے جو اُن کے بقول ''سید وقار عظیم کا ہی عکس تھے'' اور اس بات کا اعتراف کھلے دل سے کیا ہے کہ 'سید وقار عظیم کی شخصیت، سوانح اور علمی و ادبی کاموں سے متعلق نادر تحقیقی دستاویزات اور تصاویر کی فائل' ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب نے اُن کو تھمائی ۔عجیب اتفاق ہے کہ سید معین الرحمٰن بہاول نگر ڈگری کالج میں میرے رفیق کار رہے بلکہ جب وہ کراچی یونیورسٹی سے ایم ۔اے اُردو کر کے بہاول نگر واپس آئے جہاں اُن کی فیملی تقسیمِ ملک کے بعد آ کر سکونت پذیر ہوئی تھی تو میں نے اُس وقت کے پرنسپل میاں عبدالمجید مرحوم سے کہہ کر معین صاحب کو ایڈ ہاک کی بنیاد پر بہاول نگر کالج میں تعینات کرایا تھا۔

ڈاکٹر اصغر ندیم سید نے میرے اُستادِ محترم کی سوانح اور عہد، خاندانی پس منظر، ابتدائی تعلیم، اعلیٰ تعلیم، اساتذہ کرام، ملازمت اور تصنیفی و تالیفی زندگی کے آغاز، ہجرت پاکستان اورینٹل کالج لاہور سے وابستگی کی تفصیل، بیسویں صدی کے سیاسی اور ادبی منظر نامے کے حوالے سے نہایت ہنر مندی اور ایک

فاضل محقق کی حیثیت سے دی ہے۔شخصیت کا عکس ابھارنے میں بھی انھوں نے بڑی مہارت سے کام لیا ہے۔سید صاحب مرحوم کے علمی آثار کی جو تفصیل اور فہرست ڈاکٹر صاحب نے مہیا کی ہے وہ بڑی مفید اور معلومات افزا ہے۔

سر سید احمد خان نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر خدا مجھ سے پوچھے گا کہ میں دُنیا میں کیا کر کے آیا ہوں تو میں کہوں گا میں حالی سے مسدس لکھوا کے آیا ہوں۔میرا خیال ہے جب ڈاکٹر معین الرحمٰن سے اللہ پوچھے گا کہ تم دُنیا میں کیا کر کے آئے ہو تو وہ کہیں گے میں اصغر ندیم سید سے پروفیسر سید وقار عظیم پر مقالہ لکھوا کے آیا ہوں۔

مجھے خوشی اس بات پر ہے کہ میرے محبوب اُستادِ مرحوم پر میرے محبوب شاگرد، میرے عزیز اور دوست، ملک کے نام ور دانشور ڈاکٹر اصغر ندیم سید نے مقالہ لکھ کر اُن کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کیا۔میں اپنے اُستادِ گرامی کے نام ور فرزندِ ارجمند جناب اختر وقار عظیم کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اِس کتاب کا تعارفیہ لکھنے اور میرا لکھا ہوا اپنے ''بابا جانی......'' کا خاکہ شامل کرنے کا موقع فراہم کیا۔

میر تقی میر نے اپنے اور اپنے جیسے جینیئس انسانوں کے لیے بجا طور پر کہا تھا:

مت سہل ہمیں جانو ،پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

میرے مرحوم اُستادِ گرامی ،میرے مربی ّو محسن ،میرے سر پرست اور میرے کامل رہبر و رہنما سید وقار عظیم ایسی ہی نابغۂ روزگار شخصیت تھے کہ جن کو ہم سے بچھڑے کم و پیش 40 برس بیت چکے ہیں مگر اُن کی خوشگوار اور شفقت آمیز یادیں آج بھی میرے دل و دماغ میں تازہ اور درخشاں ہیں ۔اُن کا مشفقانہ رویّہ ،اُن کی محبت، اُن کا حُسنِ اخلاق اس قدر بے پایاں اور بے کراں تھا کہ اُن کی حقیقی اولاد ہو یا مجازی و معنوی اولاد یعنی اُن کے شاگرد، سب کے سب اُن کے گرویدہ اور عقیدت مند تھے اور اُن سے ٹوٹ کر پیار کرتے تھے ۔میں 1961-1963 کے سیشن میں اُن کا شاگرد رہا۔حقیقت یہ ہے کہ میرے جیسے بے آسرا اور بے وسیلہ شاگرد کے لیے اُن کی شخصیت خضر و مسیحا سے کم نہ تھی ۔ایم۔اے اُردو کی تعلیم کے دوران فکشن کا مکمل کورس انھوں نے پڑھایا، اقبالیات کا ایک حصہ بھی ہم نے اُن سے پڑھا۔تھیسس میں وہ میرے گائڈ تھے۔دنیاوی اور عملی زندگی میں قدم رکھا تو قدم قدم پر اُن کی رہنمائی مجھے حاصل رہی۔دوسرے

یہ کہ میں اپنی تعلیمی اور عملی زندگی میں جتنا متاثر اُن کی شخصیت سے ہوا اُتنا اور کسی سے نہیں۔

اُستادِ گرامی پروفیسر سید وقار عظیم دبلے پتلے، دھان پان سے انسان تھے۔ خوش قامت، سمارٹ، شیروانی اُن کے سیدھے لانبے قد پر خوب جچتی تھی۔ زیادہ تر کرتا اور علی گڑھ کٹ پاجامہ زیب تن رہتا۔ گھر کے علاوہ کبھی ہم نے انھیں شیروانی کے بغیر نہ دیکھا۔ سردیوں میں مفلر بھی ضرور ہوتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اچکن اور مفلر ان کی پہچان بن گئے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی انفرادیت کا نشان بھی۔ اُن کے بعض شاگردوں اور عقیدت مندوں نے بھی ویسا ہی حلیہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کی مثال بڑی نمایاں ہے۔ وہ دبلے پتلے ہونے کے باوجود شخصیت کی استقامت کے سبب نہایت پُروقار بلکہ مرعوب کر دینے والی اور جلالی شخصیت دکھائی دیتے تھے۔ قائداعظم کی طرح ..... فولاد کی طرح مضبوط۔ مگر جب ملتے گفتگو کرتے یا درس دیتے تو نرا جمال ہی جمال، پرکیف اور دھیما لب ولہجہ، بات میں سادگی، متانت، مٹھاس اور دل جوئی کا سا انداز۔ ذہانت، فطانت، نزاکت، شرافت اور فصاحت گویا یکجا ہو کر اُن کی دل کش شخصیت کا ناگزیر حصہ بن گئی تھی۔ مجی سہیل ربانی نے ستر کی دہائی میں اپنے ایک کالم میں لکھا تھا کہ ''وقار عظیم صاحب کا گفتگو کا انداز بڑا سادہ اور پروقار تھا۔ زندگی بھر انھوں نے کسی کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وقار صاحب تو دھیمے مگر پرکیف لہجے میں بات کرتے تھے اور دورانِ گفتگو مسکراتے جاتے تھے اور سننے والے کا دل موہ لیتے تھے۔ ان کے طرزِ گفتگو میں حد درجہ مٹھاس، دل داری، سادگی اور متانت کے عناصر گھل مل کر یک جان تھے۔'' سہیل صاحب کی کہی ہوئی بات ایک حقیقت ہے جو میرے تجربے میں آ چکی ہے۔

ان کی یہ خوبیاں محض زبانی کلامی نہ تھیں بلکہ یہ اُن کی شخصیت، کردار اور عمل کا حصہ تھیں۔ اُن کی شخصیت کا خلوص ایسا تھا کہ ہر طالب علم اُن کو اپنا سرپرست اور رہبر سمجھتا تھا۔ تعلیمی مسائل کے علاوہ اُن کے شاگرد اپنی گھریلو پریشانیاں، مالی مشکلات اور عملی رکاوٹوں کا ذکر اُن سے کرتے رہتے تھے، اپنا بزرگ اور مربی سمجھ کر ..... اور ہمارے اُستادِ محترم اُن کی عملی طور پر مدد کرتے۔ میرے علم میں ہے کہ ہمارے بعض طالب علم دوست اُن سے فیسوں اور داخلے تک کے واجبات لیتے تھے۔

میرا ایم۔ اے کا نتیجہ نکلا تو اوّل آنے والی طالبہ سے اور دوم آنے والے طالب علم سے محض دو چار نمبروں کے فرق سے میں یونیورسٹی بھر میں تیسرے نمبر پر آیا۔ چھ پرچوں میں میرے نمبر سب سے زیادہ تھے ساتویں پرچے کے لیے ہم تینوں نے مقالات لکھے تھے۔ مجھے اُن دونوں کے مقابلے میں پانچ اور

دس نمبر کم دلوائے گئے۔ میں اپنا شکوہ لے کر پرنسپل اور صدر شعبۂ اُردو ڈاکٹر سید عبداللہ کے پاس گیا۔انھوں نے ازالہ کرنے کی یقین دہانی کرائی مگر سید وقار عظیم صاحب نے مجھے خود بلا بھیجا۔حوصلہ دیا اور میرے سامنے کوئٹہ کالج کے پرنسپل کرار حسین مرحوم کو ایک مکتوب لکھ کر کوئٹہ میں میری بطور لیکچرار تقرری کی درخواست کی۔ایک ہفتے کے اندر اندر وہاں سے میرا تقرر نامہ آ گیا۔مگر اس دوران میں مجھے لاہور ڈائریکٹر یٹ سے بھی تقرری کے آرڈر مل گئے۔ میں نے فوراً اپنے دونوں اساتذہ سے رابطہ کیا اور دونوں نے مجھے بہاول نگر ڈگری کالج جوائن کرنے کا مشورہ دیا۔

میں بہاول نگر پہنچا تو ایک ہفتے بعد ہی وقار صاحب کا گرامی نامہ ملا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ ایڈہاک پر تقرری والوں کو تنخواہ ملنے میں دیر لگتی ہے اگر مجھے پیسوں کی ضرورت ہو تو ان کو لکھ دوں وہ فوراً بھجوا دیں گے۔ میں نے احساسِ ممنونیت کے ساتھ شکریہ ادا کیا اور انھیں بتایا کہ یہاں کچھ رفقائے کار ایسے ہیں جنھوں نے فی الحال ہماری کفالت کا ذمہ لیا ہے۔تنخواہ آنے پر اُن کو ادا کر دیں گے۔اس لیے آپ زحمت نہ کیجیے۔

بہاول نگر میں میری تقرری ایڈہاک پر ہوئی تھے۔ایک سال بعد لیکچرار کی اسامیاں مشتہر ہوئیں تو میں نے درخواست بھجوا دی۔چند ماہ بعد لاہور میں انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ پبلک سروس کمیشن میں پیش ہوا تو کمرے میں داخل ہوتے ہی اُستادِ محترم سید وقار عظیم صاحب پر نظر پڑی جو وہاں سبجیکٹ ایکسپرٹ کی حیثیت سے تشریف فرما تھے۔ان کو دیکھ کر محض خوشی ہی نہ ہوئی بلکہ مجھے ایک حوصلہ سا ملا اور میں بڑے اعتماد سے بورڈ کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔میرے شفیق اُستاد نے متبسّم نگاہوں سے مجھے دیکھا اور کسی اور کو سوال کرنے کا موقع دیے بغیر خود مجھ سے فرمایا: ''ہاں بھئی لیکچرار بن کے پڑھنا لکھنا چھوڑ تو نہیں دیا؟'' میں نے نہایت ادب سے کہا: ''نہیں جناب، آپ کے شاگرد ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔ میں تو پہلے سے زیادہ پڑھ رہا ہوں۔''

''تو پھر کیا پڑھ رہے ہو آج کل؟''

''جناب کالج لائبریری سے دیوانِ میر نکلوا لایا ہوں اور آج کل اس کا مطالعہ کر رہا ہوں مضمون لکھنے کے لیے۔''

فرمایا: ''اچھا تو پھر میر کا کوئی ایسا شعر سناؤ جو میر کے بہتر (72) نشتر میں نہ ہو۔''

میں نے میر کا شعر سنایا:

اُٹھتی نہیں پلک سے تا ہم تلک بھی پہنچیں
پھرتی ہیں وے نگاہیں پلکوں کے سائے سائے

(ممکن ہے مصرعوں کی جگہ میں نے تبدیل کردی ہو بہت عرصہ گزر گیا ہے۔) شعر سن کر اُستاد محترم نے تو داد دی سودی سندھی سیکرٹری تعلیمات جو بورڈ کے سربراہ تھے اپنی کرسی پر اچھل پڑے اور کہا شعر پھر سناؤ کیوں کہ وہ میر کے پرستار ہیں لیکن یہ شعر ان کی نظر سے نہیں گزرا۔ میں نے دوبارہ لہک لہک کر وہ شعر سنایا۔ پھر باقی سوال و جواب بھی زیادہ تر میرے اُستاد محترم ہی نے کیے اور آدھے پونے گھنٹے بعد میں اپنی طرف سے مطمئن ہو کر باہر آ گیا۔ دوسرے دن اُن سے ملے بغیر میں بہاول نگر لوٹ آیا۔ میں اس لیے ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوا کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ میں نتیجہ پوچھنے آیا ہوں۔ جب منتخب اُمیدواروں کی فہرست آئی تو اپنے بہت سے پیارے دوستوں کے ساتھ میرا نام بھی کامیاب اُمیدواروں میں شامل تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے انتخاب میں میرے شفیق اُستاد کا ہاتھ تھا۔ اللہ انھیں اس کا اجر دے۔

زمانۂ طالب علمی میں ایم۔اے اُردو کے طالب علموں کو تعلیمی دورے پر کراچی میں اُستاد محترم سید وقار عظیم لے کر گئے تھے۔ یہ 1962 کی بات ہے۔ وہاں ہمارا ایک ہفتہ قیام رہا۔ مجھے یاد ہے اُن کے صاحبزادے اختر وقار عظیم (جو اُس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں انٹر کر رہے تھے) ہمارے ساتھ تھے۔ سید صاحب ایک ایک طالب علم کا ذاتی طور پر خود خیال رکھتے۔ کھانا اپنے سامنے پکواتے اور سب طالب علموں کو اپنے سامنے کھلاتے اور اطمینان کر لینے کے بعد خود جا کر کھاتے۔ کراچی یونیورسٹی، کلفٹن، منوڑا، کیماڑی، مزارِ قائد ہر جگہ خود لے کر گئے اور طالب علموں میں یوں گھل مل گئے جیسے ہمارے اُستاد کم اور دوست زیادہ ہوں۔ حالاں کہ اُن کی سنجیدگی اور متانت کی بنا پر سب اُن کا عقیدت کی حد تک احترام کرتے تھے اور بے تکلفی کی جرات نہیں کرتے تھے مگر کراچی کے تعلیمی دورے میں ہمیں ان کی بے تکلف شفقت نصیب ہوئی۔

جہاں تک مجھے یاد ہے سید وقار عظیم صاحب کی کوٹھی سمن آباد میں تھی۔ جہاں اُن سے ملنے اُن کے احباب کے علاوہ ان کے شاگرد بھی جایا کرتے تھے۔ ہمارے ہم جماعت انیس احمد اعظمی تو اکثر ان کے ہاں جاتے رہتے۔ میں بھی کبھی کبھی ان کے دولت خانے پر حاضری دیتا تھا۔ وہ واحد اُستاد تھے جن کی رہائش گاہ پر جاتے ہوئے ان کے شاگرد ہچکچاہٹ یا حجاب محسوس نہ کرتے تھے۔ سید وقار عظیم شاگردوں

سے بڑی محبت سے پیش آتے ۔اُن کو بٹھاتے ،اُن کو وقت دیتے ،دل جوئی فرماتے ،حوصلہ بڑھاتے ،ان کی لائبریری بہت بڑی تھی ۔نایاب کتابیں بھی اُن کے پاس موجود تھیں ۔جس کسی شاگرد کو ضرورت پڑتی استفادہ کرنے کی اجازت ہوتی تھی ۔انیس احمد اعظمی ،اسلم انصاری اور بعد میں سید معین الرحمٰن تو کتابیں عاریتاً لے بھی جاتے تھے ۔اُستادِ گرامی کبھی منع نہ کرتے جب کہ ہمارے بعض اساتذہ کے پاس بہترین لائبریریاں تھیں مگر اُن تک رسائی کسی کو نہ ہوتی تھی ۔کہتے ہیں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی لائبریری نایاب کتب اور رسائل سے بھری ہوئی تھی مگر وہاں تک رسائی کسی کو نہ تھی ۔البتہ سنا ہے آخر میں انھوں نے اپنی پوری لائبریری گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کو دے دی ۔اللہ اُن کو اجر دے ۔(روایت ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن مرحوم نے جو دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ مرتب کیا تھا وہ اصل میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی ملکیت تھا لیکن عارضی طور پر سید وقار عظیم کے پاس تھا اور ڈاکٹر صاحب نے وہیں سے لیا تھا ۔(واللہ اعلم بالصواب)

مجھے بھی اکثر درِ دولت پر حاضری کا موقع ملتا تھا ۔کبھی تھیسس کے سلسلے میں ،کبھی فکشن کے پرچے کے ذیل میں ۔گرمیوں اور سردیوں کی چھٹیاں ملتان میں گزار کر واپس لاہور آتا تو پھر لازمی طور پر ان کے ہاں حاضری دیتا کیوں کہ ملتان سے واپسی پر میں ملتان کی سوغات ،سردیوں میں سوہن حلوہ اور گرمیوں میں آموں اور کھجوروں کا تحفہ اُن کے لیے ضرور لاتا اور اُن کے دولت خانے پر جا کر پیش کرتا ۔ اندر آواز دیتے :''بھئی !یہ چیزیں اُٹھوا لو ۔اشرف صاحب نے پھر تکلف کیا ہے ۔''پھر مجھے مخاطب ہو کر فرماتے :''بیٹا !ہر دفعہ کیوں بوجھ اُٹھاتے پھرتے ہو ۔بس ایک آدھ دفعہ ہو گیا ٹھیک ہے ۔''میں شرم سے سر جھکا لیتا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا آتا ۔اس دوران دیکھتا کہ اپنے بچوں کے ساتھ ان کا سلوک بالکل دوستوں جیسا ہوتا ۔بے حد شفقت فرماتے اور ان سے والہانہ پیار کرتے ۔بلاشبہ والدین اپنے بچوں میں بالکل فرق نہیں کرتے ۔اُن کی محبت اپنی ساری اولاد کے لیے یکساں اور ایک جیسی ہوتی ہے مگر بعض بچے اپنی منفرد عادات یا صفات کی بدولت والدین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتے ہیں ۔میرا اندازہ ہے کہ اختر بہن بھائیوں میں اُن کی توجہ زیادہ لیتے تھے کیونکہ جب ہم کراچی تعلیمی دورے پر گئے تو اُنھوں نے اختر صاحب کو اپنے ساتھ لیا ۔میں اُن کو اُسی زمانے سے جانتا ہوں ۔وہ اکثر گورنمنٹ کالج سے اورینٹل کالج سید صاحب سے ملنے آتے تھے ۔جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے بڑے صاحبزادے انور وقار عظیم بینک میں ملازم تھے ۔اختر وقار عظیم ہسٹری میں ایم ۔اے کر رہے تھے اور ان سے چھوٹے صاحبزادوں کی بھی تعلیم ابھی جاری تھی ۔بعد میں اختر وقار عظیم اور ان سے چھوٹے صاحبزادے

اطہر وقار عظیم نے ٹی وی میں ملازمت اختیار کر لی اور دونوں بھائیوں نے میڈیا کی دنیا میں نام پیدا کیا۔ اختر وقار عظیم تو ماشاءاللہ ایم ڈی کے بلند ترین عہدے پر پہنچے۔ زمانۂ طالب علمی میں وہ اپنے "بابا" کی طرح دبلے پتلے، دراز قد اور قدرت کی طرف سے اعلیٰ ترین صفات سے متصف تھے۔ انھوں نے حال ہی میں "ہم بھی وہیں موجود تھے" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی ہے۔

ہمارے اساتذہ میں سے ہر ایک کا لیکچر دینے کا انداز اپنا ہوتا تھا۔ سید عبداللہ ٹہلتے ہوئے لیکچر دیتے تھے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار روسٹرم پر کھڑے ہو کر اس فرق کے ساتھ کہ عبادت صاحب طلبہ و طالبات کو دیکھ کر (زیادہ طالبات کو) لیکچر دیتے اور شعر پڑھتے اور ذوالفقار صاحب چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بے تکان بولتے چلے جاتے۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب آتے ہی کرسی پر ڈھیر ہو جاتے۔ کتابیں پاس رکھی میز پر رکھ لیتے اور گفتگو کے دوران میں کتابوں سے اقتباسات بھی پڑھتے جاتے۔ سید وقار عظیم صاحب کمرے میں تشریف لاتے تو سناٹا چھا جاتا۔ سب طلبہ و طالبات احتراماً کھڑے ہو جاتے۔ وقار صاحب بڑے شفیق انداز میں مسکراتے اور یہ مسکراہٹ اتنی دل پذیر ہوتی تھی کہ ہم سب کو اپنی شفقت کے سائے میں لے لیتی۔ روسٹرم پر حاضری لے کر کرسی پر بیٹھ جاتے اور لیکچر شروع کر دیتے۔ نہایت سادہ انداز میں پڑھاتے۔ فکشن کا حصہ کہانی کی طرح دلچسپ انداز میں یوں ذہن نشین کراتے کہ دوبارہ اسے پڑھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ اقبالیات کے فلسفیانہ نظریات کو پانی کر کے رکھ دیتے۔ فن اور فنکار کے رشتے تلاش کرتے وقت کہانی کہنے کا سا انداز اختیار کر لیتے اور طلبہ و طالبات اُن کے دل رُبا انداز بیان میں کھو جاتے۔

سید وقار عظیم سراپا اخلاص و اخلاق تھے۔ نہایت شفیق اور نرم خو اُستاد۔ میں نے دو سال کے عرصۂ تعلیم میں انھیں کبھی غصّے میں یا ناراض ہوتے نہ دیکھا۔ نہ کسی شاگرد سے اور نہ ہی کسی اور انسان سے۔ کلرکوں اور چھوٹے ملازموں سے بھی عزت کے ساتھ مخاطب ہوتے یا بلاتے۔ تمام طلبہ و طالبات سے ایک جیسا سلوک کرتے۔ ان کی شفقت سب کے لیے یکساں بھی تھی اور فراواں بھی۔ مجھے تو اپنی قسمت پر ناز ہے کہ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ اُن کی محبت، ان کی شفقت، ان کی دُعاؤں کے طفیل میں نے اپنی عملی زندگی کا سفر کامیابی سے طے کیا۔

سہیل ربانی صاحب کا ایک حوالہ پھر درج کرتا ہوں۔ انھوں نے نومبر 1976 میں (امروز میں) وقار صاحب پر کالم لکھتے ہوئے درج کیا تھا کہ

''......وقار صاحب اے بی اشرف کو بہت پیار کرتے تھے اور میں نے دیکھا کہ اشرف صاحب کی تنی ہوئی کمر اپنے اُستاد کے سامنے خمیدہ ہوتی اور جب وقار صاحب محبت اور پیار سے اُن کے شانوں کو تھپتھپاتے تو اشرف صاحب کا چہرہ مارے خوشی کے سرخ ہو جاتا ۔10 نومبر کو سید افتخار حسین شاہ کے مکان پر وہ اے بی اشرف کو یاد کرتے رہے اور جاتے ہوئے دعا کہہ گئے ۔''

اب میں سوچتا ہوں تو کچھ یاد نہیں پڑتا کہ آخر میں اس موقع پر کیوں موجود نہ تھا۔

وقار صاحب ملتان تشریف لائیں اور میں شہر میں موجود ہوں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان کی قدم بوسی نہ کرتا اور ان کے ساتھ ساتھ نہ رہتا ۔یقیناً یا تو میں ملتان میں ہوں گا نہیں یا پھر یہ واقعہ اُس زمانے کا ہوگا جب میں بہاول نگر میں تعینات تھا۔میرے حافظے میں بالکل نہیں آ رہا۔

میرے اُستاد گرامی قدر سید وقار عظیم 15 اگست 1910 کو الہ آباد میں پیدا ہوئے ۔بی ۔اے لکھنؤ سے،ایم ۔اے الہ آباد سے اور بی ۔ٹی علی گڑھ سے کیا۔الہ آباد یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور دہلی پالی ٹیکنیک گورنمنٹ آف انڈیا کے ساتھ بطور اُستاد وابستہ رہے ۔ماہنامہ'' آج کل'' دہلی میں مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔پاکستان آنے کے بعد ماہنامہ'' ماہِ نو'' ماہنامہ'' نقوش اور سہ ماہی'' اُردو''(انجمن ترقی اُردو کراچی) کی ادارت کے فرائض انجام دیے اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے ہو کر رہ گئے ۔سید وقار عظیم واحد مثال ہیں کہ پی ۔ایچ ۔ڈی کیے بغیر نہ صرف پروفیسر بنے ،صدر شعبۂ اُردو رہے بلکہ انھوں نے بڑے بڑے اساتذہ اور نامور سکالرز کو پی ۔ایچ ۔ڈی کرائی ۔ان کی نگرانی میں پی ۔ایچ ۔ڈی کرنے والوں میں ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر محمد اسلم، ڈاکٹر عبید اللہ خان، ڈاکٹر اقبال احمد خان جیسے جید علما اور محققین شامل ہیں ۔پنجاب یونیورسٹی کے تمام وائس چانسلر سید وقار عظیم کی بے حد عزت کرتے تھے ۔پروفیسر حمید احمد خاں وائس چانسلر بنے تو سید وقار عظیم صاحب کو خصوصی اہمیت حاصل ہوئی ۔وہ ان کو بے پناہ احترام دیتے تھے اور ہر معاملے میں اُن سے مشورہ لیتے تھے ۔مجلس یادگار غالب قائم ہوئی تو اس کے صدر پروفیسر حمید احمد خاں تھے ۔انھوں نے ارکانِ مجلس میں سید وقار عظیم کا نام گرامی شامل کیا۔پروفیسر علاؤالدین صدیقی وائس چانسلر جامعہ پنجاب کے زمانے میں سید وقار عظیم صاحب کو غالب پروفیسر بنایا گیا۔(اگرچہ اس کا فیصلہ حمید احمد خاں کے زمانے ہی میں ہو چکا تھا ۔)اسی مجلس نے غالب کے پہلے صد سالہ یومِ وفات کی تاریخی تقریب پر اُن کی سب اُردو فارسی تصانیف،اصل متن کی تحقیق کے بعد شائع کرنے کا فیصلہ بھی کیا۔اُردو دیوان غالب کو بہ تحقیق متن و ترتیب

مولانا حامد علی خاں صاحب نے مرتب کیا تھا اور جسے 1969 میں پنجاب یونیورسٹی نے باہتمام شائع کیا۔

سید وقار عظیم کی تصنیف و تالیف کردہ کتب کی فہرست مرتب کی جائے تو ان کی تعداد پچاس سے اوپر تک جاتی ہے۔ مقالات و مضامین کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے۔ درسی کتب ان کے علاوہ ہیں۔ اُردو فکشن پر وقار صاحب کا کام اتنا وقیع اور جامع ہے کہ کوئی دوسرا فکشن کا نقاد ان کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ فکشن پر ان کی پہلی تنقیدی کتاب ''فنِ افسانہ نگاری''منشی پریم چند کے قائم کردہ سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد سے 1935 میں شائع ہوئی۔ دوسری کتاب ''ہمارے افسانے'' بھی اسی سال اُسی پریس سے شائع ہوئی۔ پھر ''نیا افسانہ''، ''ہماری داستانیں''، ''داستان سے افسانے تک''، ''باغ و بہار اور اُس کا مصنف ......'' ایسی بلند پایہ تنقیدی کتابیں لکھیں۔ کئی مشہور داستانوں کے انتخاب اور خلاصے کیے تا کہ کلاسیکی ادب سے نوجوان نسل بھی استفادہ کر سکے۔ ان خلاصوں میں الف لیلیٰ، فسانۂ عجائب، داستانِ امیر حمزہ، حاتم طائی، رانی کیتکی کی کہانی، باغ و بہار وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ فکشن پر اُن کا کام صرف عملی تنقید تک محدود نہ رہا بلکہ انھوں نے فن اور مبادیاتِ فن پر بھی بہت کام کیا۔

وقار صاحب کے علمی اور ادبی کاموں کا ایک اہم پہلو دیگر زبانوں کے تراجم بھی ہیں۔ انھوں نے بے شمار کتابوں اور مضامین کو اُردو زبان میں منتقل کیا۔ ایک مترجم کی حیثیت سے بھی اُن کا مقام بہت اُونچا ہے۔ ان کے اہم متراجم میں ایمرسن کے مضامین، امریکی ناول اور اس کی روایت، دنیا کی مختصر تاریخ، تلاشِ ہند وغیرہ شامل ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ عام طور پر وقار صاحب کو افسانوی ادب کا نقاد تسلیم کیا گیا حالاں کہ انھوں نے شعر و شاعری پر بھی بے حد توجہ دی اور اس میدان میں بھی اُن کا کام کچھ کم نہیں ہے۔ ''اقبال ......شاعر اور فلسفی'' اس کی واضح مثال ہے۔ ''اقبال ......فکر و فن' اس کے علاوہ ہے۔ ''مثنوی گلزارِ نسیم' اور آتش کا دیوان مرتب کیا۔ ان کے مقالات و مضامین میں سے کم و بیش تین درجن مضامین شعر و شاعری کے موضوع پر ہیں۔ حالی، داغ، اکبر، حسرت، جوش، مجاز، ناصر کاظمی اور کئی دوسرے شاعروں کی شاعری پر ان کے تنقیدی مضامین موجود ہیں۔ ٹیلی وژن کے پروگرام '' آمنا سامنا'' میں وقار صاحب نے خود اس پہلو کی طرف اشارہ کیا تھا کہ انھیں شعر و شاعری سے بڑا شغف رہا۔ حافظ، سعدی، غالب اور اقبال سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ ایک دفعہ اُنھوں نے کلاس میں بتایا کہ اُن کے سرہانے ''دیوانِ حافظ'' اور ''دیوانِ غالب'' رکھے رہتے ہیں۔

نقاد، محقق، مترجم اور مدیر کے علاوہ ان کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو بطور معلم کے ہے۔ انھوں

نے کم وبیش چالیس برس تک درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔ وہ ہمدرد، شفیق اور پرخلوص اُستاد تھے۔ تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ طلبہ اور طالبات کے تمام مسائل میں مدد کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ اُردو کے سربراہ اور "کرسی غالب" کے صدر نشین ہونے کے علاوہ وہ کم وبیش دو درجن علمی و ادبی اداروں کے کنوینر، نگران، معتمد یا رکن تھے۔ یوں دیکھنے میں دُبلے پتلے مگر حرکت وعمل کی وہ بجلی ان کے جسم ناتواں میں بھری ہوئی تھی کہ بڑے بڑے توانا اور تن وتوش رکھنے والے بھی شاید عمل کی اس قدر توانائی اور طاقت نہ رکھتے ہوں۔ ہم معمولی معمولی باتوں پر گھبرا جاتے ہیں، ہمت ہار بیٹھتے ہیں حالاں کہ اس دور میں ہمیں جو سہولتیں سائنس نے مہیا کر دی ہیں وہ ہمارے ان عظیم اساتذہ کو حاصل نہ تھیں مگر آفرین ہے ہماری ان عظیم ہستیوں پر کہ جو ذمہ داریوں کے عظیم بوجھ سر پر اُٹھائے پورے عزم واستقامت کے ساتھ زندگی کا سفر طے کرتی رہیں خود بھی منزل پر پہنچیں اور ہمارے لیے بھی دلیل راہ اور نشانِ منزل بنیں۔

ہمارے اُستادِ محترم سید وقار عظیم ایسی ہی عظیم شخصیتوں میں بے حد نمایاں تھے۔ وہ ہمارے اساتذہ میں سب سے زیادہ روشن خیال، لبرل اور سائنسی شعور کے حامل تھے انھوں نے اپنے پیچھے علم وادب، تنقید وتحقیق، علم وشعور اور روشن خیالی کا ایسا سرمایہ چھوڑا ہے جو اُن کے ہزاروں، لاکھوں شاگردوں کا قابلِ فخر ورثہ ہے۔ اور یہ ورثہ اُنھیں ہمارے دلوں سے کبھی محو نہ ہونے دے گا۔ ہم جب بھی ان کی کوئی کتاب اُٹھا کر اُس سے رہنمائی حاصل کرنا چاہیں گے تو وقار صاحب اُس میں تبسم کناں، پورے اعتماد، تیقن اور وقار کے ساتھ بولتے، ہماری رہنمائی کرتے اور یہ کہتے دکھائی دیں گے:

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ڈاکٹر اے بی اشرف

باب اول:

سید وقار عظیم......سوانح، عہد، شخصیت

اگر چہ قیامِ پاکستان سے پہلے پنجاب اور خصوصاً لاہور اُردو کے ایک بڑے تہذیبی وثقافتی مرکز میں تبدیل ہو چکا تھا اور اُردو کے صفِ اوّل کے ادیب انگریزوں کی زیرِ سرپرستی علمی اور ادبی دنیا میں اثر انگیز تبدیلیاں لا رہے تھے۔ محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، اسماعیل میرٹھی کے بعد کچھ ایسی فضا بن گئی تھی کہ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج نسبتاً قدامت پسندوں کا مسکن بن رہا تھا اور گورنمنٹ کالج لاہور جدت پسند، تربیت یافتہ، ذوقِ جمال رکھنے والے فنونِ لطیف کی فعالیت سے کام لے کر ایک سیکولر فنون پرور ماحول بنانے والے افراد کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔ جس میں پروفیسر احمد شاہ بخاری، پروفیسر سراج، ن۔م راشد، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ڈاکٹر نذیر احمد اور اس طرح کے لوگوں کا بڑا حصہ ہے جن کے ساتھ سید عابد علی عابد، امتیاز علی تاج، عبدالمجید سالک، ڈاکٹر دین محمد تاثیر اور چراغ حسن حسرت جیسے تخلیقی ذہن رکھنے والے مجلس آرا لوگ نئے ذہنوں کی آبیاری کر رہے تھے لیکن پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور کی علمی مسابقت لاہور کی فکری اور تخلیقی فضا میں زرخیزی پیدا کر رہی تھی۔ ایسے میں تقسیم ہند کے بعد تعلیم یافتہ اور علمی حلقوں میں معروف اساتذہ یو پی سے لاہور منتقل ہوئے اور ان دانش گاہوں سے وابستہ ہوئے اور پھر اورینٹل کالج کی علمی اور ذہنی فضا میں بھی تبدیلی آئی۔ انھی میں سید وقار عظیم بھی تھے۔ وہ اورینٹل کالج لاہور سے وابستہ ہوئے، نقوش، لاہور کو بھی مرتب کیا اور پھر تین سے زائد عشروں تک تین نسلوں کی ذہنی آبیاری کی۔ ان کی کتابیں اب تک اُردو دنیا میں ایک بنیادی حوالہ رکھتی ہیں۔

الف) سوانح:

میٹرک کے سرٹیفکیٹ کے مطابق آپ کی تاریخ ولادت 15 اگست 1910 ہے۔ اس بارے میں ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا:

''میری تاریخ ولادت دسمبر 1910 ہے۔لیکن داخلے کے وقت اسکول میں بعض باتیں تھیں ،اس وقت میٹرک کا امتحان ایک خاص عمر سے پہلے نہیں دے سکتا تھا طالب علم تو جن صاحب نے ،میرا داخلہ کرایا انھوں نے دسمبر 1910 کے بجائے اگست 1910 لکھوا دی تو اس طرح صحیح تاریخ ولادت کچھ بھی سہی ،لیکن دستاویزات میں 15اگست 1910 رہی اور اسی کو میں اب صحیح تاریخ ولادت سمجھتا ہوں۔''

(وقار عظیم سید،فن اور زندگی۔انٹرویو،نقوش،لاہور،جنوری 1977 ،صفحہ 589)

سید وقار عظیم کے دادا کا نام فضل عظیم تھا جو ڈپٹی کلکٹر کے طور پر پہلی بار ہمیر پور (کانپور) میں تعینات ہوئے۔ان کے بیٹے سید مقبول عظیم 1300ھ میں پیدا ہوئے۔اقبال عظیم فرماتے ہیں:

''والد بزرگوار کے نام میں ''محمدی'' کے اضافے سے ان کا سن ولادت برآمد ہوتا ہے۔
مقبول عظیم +محمدی=1300ھ مطابق 12 نومبر 1882 تا یکم نومبر 1883 ۔''

(نقوش،لاہور،جنوری 1977 ،صفحہ 589)

سید مقبول عظیم پولیس میں ملازم تھے۔تاہم شعر گوئی سے انھیں خاص شغف تھا۔عرش تخلص کیا کرتے تھے۔وہ بیان یزدانی میرٹھی کے شاگرد تھے۔

اپنے والد کا ایک جگہ سید وقار عظیم صاحب نے خود یوں ذکر کیا ہے:

''میرے والد بزرگوار سید مقبول عظیم پولیس میں ملازم تھے۔انھیں اپنے سرکاری کاموں سے بہت کم فرصت ملتی تھی۔وہ کبھی کبھی پڑھائی کے معاملے میں مجھ سے پوچھ لیا کرتے تھے.....نعت سے انھیں خاصی دلچسپی تھی۔بڑی اچھی نعتیں کہتے تھے،گھر میں ان کے دوست احباب آکر بیٹھتے۔محفل جمتی اور ہم وہاں جا بیٹھتے۔والد صاحب یوں تو پولیس میں ملازم تھے مگر ان میں پولیس والوں جیسی شاید ہی کوئی عادت پائی جاتی تھی۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی میں اکثر لوگوں کو کس طرح فقط پیٹ کی خاطر اپنے مزاج کے خلاف کوئی دوسرا کام کرنا پڑتا ہے اور عمر عزیز اسی طرح گزر جاتی ہے۔''

(معین الرحمان،سید،سید وقار عظیم (سوانحی خاکہ) صفحہ 26)

سید وقار عظیم کا اصل وطن انبیٹھہ ہے جو کہ تحصیل گنگوہ کے قریب ضلع (سہارنپور) کا ایک قصبہ ہے۔اُن کی ننھیال میرٹھ کی تھی۔آپ کے نانا ادیب میرٹھی تھے،جو کہ صاحب دیوان غزل گو شاعر تھے۔

وہ داغ کے رنگ میں غزل کہتے تھے ۔آپ کے دو ماموں بھی شاعر تھے ۔بڑے ماموں لبیب اور چھوٹے ماموں طبیب تخلص کرتے تھے ۔سید وقار عظیم کی والدہ بھی گو کہ گھریلو خاتون تھیں تاہم وہ بھی اُردو، فارسی دینیات سے واقف تھیں ۔وقار عظیم صاحب کی حقیقی والدہ کا انتقال 1922 میں ہوا ۔اس وقت وہ اپنے میکے میرٹھ میں تھیں ۔وقار عظیم صاحب کے والد سید مقبول عظیم دو تین مہینے وہاں رہے اور جب میرٹھ سے واپس کانپور آئے تو وقار عظیم صاحب کی سگی خالہ (کلثوم بیگم) دوسری والدہ کی حیثیت سے ان کے ساتھ تھیں ۔پہلی والدہ سے ان کے چار بہن بھائی ،وقار عظیم ،اقبال عظیم ،مسعودہ بیگم،معراج عظیم موجود تھے۔ جب وقار عظیم کی عمر چھبیس برس تھی تو آپ کی دوسری والدہ کا بھی انتقال ہو گیا جن سے آپ کے تین بہن بھائی محبوب مشیر، احمد عظیم، حامد عظیم موجود تھے ۔دوسری والدہ کے انتقال کے دو مہینے بعد مئی 1935 میں والد مقبول عظیم بھی اللہ کو پیارے ہو گئے ۔

سید وقار عظیم نے ابتدائی تعلیم گھر سے حاصل کی ۔والدہ صاحبہ انھیں اُردو، دینیات اور کلام پاک پڑھاتیں ۔فارسی کی ایک کتاب بھی انھوں نے والدہ سے پڑھی ۔اس زمانے میں ابتدائی تعلیم کے لیے سکول نہیں ہوتے تھے بلکہ پرائمری تعلیم مکتبوں میں حاصل کی جاتی تھی ۔طلبہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں الگ الگ بیٹھے ہوتے اور اُستاد باری باری ان کو سبق دیتے ۔چھٹی جماعت میں آپ کانپور کے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل ہوئے ۔وہاں بقول سید وقار عظیم:

> ''ایک پنڈت جی نے پڑھانا شروع کیا جنھیں عام طور پر لوگ پٹواری جی کہا کرتے تھے اور جو ٹیوشن کیا کرتے تھے ۔شروع شروع میں تو وہ بس گھر جا کر پڑھا دیتے، پھر مجھ سے اتنے مانوس ہوئے کہ جہاں بھی پڑھانے جاتے مجھے اپنے ساتھ لے جاتے ۔ان کا زیادہ زور حساب پر ہوتا ۔حساب کی ایک مشہور کتاب تھی ''چکروتی'' اسی سے سوال کروایا کرتے تھے ۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا تو مجھے نویں دسویں کے طلبہ کے ساتھ بٹھا کر سوال کرنے کو دیتے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ میں سوال حل کر لیتا مگر نویں دسویں کے طلبہ حل نہ نکال سکتے ......ان کے کرائے ہوئے سوال مجھے ابھی تک اچھی طرح یاد ہیں ۔'' (سید وقار عظیم، سوانحی خاکہ، صفحہ 27)

سید وقار عظیم کے والد کا تبادلہ 1919 میں اناؤ میں ہو گیا ۔اناؤ کانپور سے کوئی گیارہ میل کے

فاصلے پر ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ یہ لکھنؤ اور کانپور کے درمیان واقع ہے۔ حسرت موہانی کا قصبہ موہان بھی اسی ضلع کی تحصیل ہے۔ اناؤ ایک چھوٹی سی بستی تھی وہاں کی کل آبادی بارہ ہزار تھی۔

''کانپور سے گیارہ میل اور لکھنؤ سے چونتیس میل کے فاصلے پر، ریل دن بھر چلتی ہے
دن میں آٹھ گاڑیاں کانپور سے لکھنؤ جاتی ہیں۔کانپور کا مزاج بالکل کاروباری ہے،
لکھنؤ کا مزاج خالصتاً علمی وادبی اور تہذیبی۔اس کا اثر اناؤ پر پڑا تو ملی جلی معاشرت کا
نمونہ ہے یہ چھوٹا سا شہر۔'' (رسالہ نقوش، لاہور، جنوری 1977 صفحہ 590)

اناؤ میں سید وقار عظیم کو علمی وادبی فضا میسر آئی۔اس ضلع کے بہت سے شعرا وادبا نے ہندوستان بھر میں شہرت حاصل کی۔اناؤ کے متصل قصبے (صفی پور) سے عزیز صفی پوری، مولانا ولایت علی خان (غالب کے شاگرد) مشہور ہوئے۔گنج مرادآباد میں مولوی فضل الرحمان کا مزار ہے، جہاں عرس کی محفل ہوتی تھی۔

سید وقار عظیم کے والد کا حلقۂ احباب بھی شعرا وادبا پر مشتمل تھا۔مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی، جگت موہن رواں، رضی بدایونی، فرخ بناری (داغ کے شاگرد) کا آنا جانا، گھر میں شعر و شاعری کی باتیں ہونا۔اس پر مستزاد کہ گھر میں اُردو اور فارسی کے مشہور شعرا کے دیوان موجود تھے۔کتابوں سے الماریاں بھری ہوئی تھیں اور گھر میں کئی قسم کے رسائل آتے تھے، جن سے فیض یاب ہونے کا اکثر انھیں موقع ملتا تھا۔خود کہتے ہیں:

''دراصل ہمارے گھر کا ماحول ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ اگر میری جگہ کوئی دوسرا بچہ
ہوتا تو وہ بھی اس سے متاثر ہوتا اور میری طرح اسے بھی پڑھنے لکھنے کا شوق ہوتا۔''
(سید وقار عظیم، سوانحی خاکہ، صفحہ 27)

علامہ اقبال سے دلچسپی کا آغاز بھی اسی دور میں ہوا۔شعرا کی صحبت، شعر و سخن کی محافل میں شرکت نے تنقیدی شعور کو جلا بخشی۔

''شعر و سخن کی طویل محفلیں گرم ہوتیں، میں پان یا کوئی چیز دینے کی خاطر کمرے میں آتا تو
ایک آدھ شعر میرے کان میں پڑ جاتا جو اکثر مجھے یاد ہو جایا کرتا۔بعد میں والد صاحب
مجھے دیدہ دانستہ ایسی محفلوں میں بٹھانے لگے کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ ایسی محفلیں بچوں
کی تربیت کے لیے بڑی مفید ہوتی ہیں۔'' (سید وقار عظیم، سوانحی خاکہ، صفحہ 28)

گورنمنٹ ہائی سکول میں وقار عظیم صاحب کو مولوی انوار الحق جیسے اُستاد فارسی پڑھایا کرتے

تھے۔آپ کے نصاب میں گلستان کی چند حکایتیں شامل تھیں لیکن مولوی صاحب کی فارسی نے شوق کو ایسی جلا بخشی کہ ساری کتاب گھر میں پڑھ ڈالی ۔اپنے ایک اور اُستاد کے متعلق کہتے ہیں:

''ہمارے اُردو کے اُستاد بھی بہت اچھے تھے۔وہ پڑھانے کے دوران اشعار کا حوالہ دیتے جاتے ان کی بدولت مجھے میر، غالب کی کئی غزلیں ازبر ہوگئیں۔''(سید وقار عظیم،سوانحی خاکہ،صفحہ 29)

شعروشاعری کی اس پُرمغز فضا کا اثر یہ ہوا کہ وہ خود بھی شاعری کی طرف مائل ہو گئے۔طالب علمی کے اس دور کی غزلیں اوران کے اثرات کے متعلق لکھتے ہیں:''وہ شعر کیا تھے بس تک بندی ہوتی تھی مثلاً ہمارے ایک دوست حشمت علی تھے۔ایک دفعہ ہم نے ان پر ایک مصرع کہا۔ایک اس لیے کہ دوسرا مصرع غالب کا ہے۔

جان لیوا ہیں ناز حشمت کے
موت آتی ہے پر نہیں آتی

شعر گوئی کا یہ رجحان بہت جلد ترک کر دیا جس کا تجزیہ اُنھوں نے خود کیا اور ترک شاعری کی وجہ کچھ یوں بیان کی کہ مختلف شعرا کی کتب کے مطالعے نے اس شوق کو ختم کر دیا۔(ماہنامہ سیارہ، لاہور (اشاعت خاص)ستمبر 1965 صفحہ 61)

آٹھویں جماعت میں سید وقار عظیم نے وظیفہ کا امتحان دیا جس میں پورے صوبے کے طلبہ شریک ہوتے تھے،آپ نے بھی اچھے نمبروں سے یہ امتحان پاس کر کے وظیفہ حاصل کیا۔اسی وظیفہ کی رقم سے مولوی انوارالحق کے کہنے پر کتب خریدنا شروع کیں۔یوں درسی کتابوں کے علاوہ نئی کتابیں پڑھنے کا شوق بھی پیدا ہوتا چلا گیا۔1926 میں آپ نویں جماعت میں تھے اس وقت آپ کو پہلا وظیفہ 25 روپے ملا اور والد صاحب کے کہنے پر انھوں نے لکھنؤ سے اپنے ایک عزیز کے ساتھ صدیق بک ڈپو سے اپنی پسند کی کتب خریدنا شروع کیں۔کہتے ہیں:

''میں نے بڑے اشتیاق سے صفدر مرزاپوری کا مرتب کردہ ادیبوں کے خطوط کا مجموعہ، ان ہی کا مرتب کردہ ادبی لطائف کا مجموعہ،مسدسِ حالی ،آبِ حیات ،نیرنگِ خیال، خریدیں۔دیوانِ غالب بھی پہلی قسط میں خریدی ہوئی کتابوں میں شامل تھا۔ان کے علاوہ سموئیل اسامیلز کی دو انگریزی کتب Self Help اور Duty اپنے انگریزی

کے اُستاد کے مشورے سے خریدیں۔''(سیدوقارعظیم،سوانحی خاکہ،صفحہ 30)

یوں نویں دسویں جماعت میں ستر اسی کتب پر مشتمل ایک ذاتی لائبریری بن گئی جن میں شاعری اور تنقید کی کتابیں اور شرر اور ڈپٹی نذیر احمد کے اور پریم چند کے ناول وغیرہ شامل تھے۔آب حیات کے مطالعے نے انھیں تنقیدی شعور کی طرف مائل کیا۔گورنمنٹ ہائی سکول اناؤ سے ایک رسالہ بھی نکلتا تھا جس میں آپ بھی لکھتے تھے۔اناؤ سے ایک ہفت روزہ ''آفتاب'' شائع ہوتا تھا،جس کے ایڈیٹر وقارعظیم صاحب کے پڑوس میں رہتے تھے۔ایک مرتبہ سید وقارعظیم اپنے والد کے ساتھ صفی پور عرس پر گئے۔ جہاں مشاعرہ منعقد ہوا۔ایڈیٹر صاحب کے کہنے پر آپ نے مشاعرہ کی روداد تحریر کی۔خود فرماتے ہیں:

''یہی روداد میرا پہلا مضمون ہے جو میں نے سکول کے رسالے سے الگ کسی باہر کے اخبار کے لیے لکھا،یہ 1929 کا ذکر ہے۔''(ماہنامہ'سیارہ'،لاہور دسمبر 1962 صفحہ 82)

سید وقارعظیم نے میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول اناؤ سے پاس کیا۔جس کے بعد آپ لکھنؤ چلے گئے اور وہاں گورنمنٹ جوبلی انٹرمیڈیٹ کالج میں داخلہ لیا، یہاں مولوی محمد حسین (فارسی)، علی عباس حسینی (اُردو)اختر علی تلہری (اُردو)اور حامد اللہ افسر جیسے قابل اساتذہ سے آپ نے کسبِ فیض کیا۔

''حامد اللہ افسر صاحب کی شاعری اور تنقید نے بہت متاثر کیا،وہیں سے تنقید لکھنے کا شوق پیدا ہوا،ان دنوں علی عباس حسنی صاحب ''ناول کی تاریخ اور تنقید'' لکھ رہے تھے وہ اس کتاب کے کئی باب ہمیں پڑھ کر سناتے...... ان کی اس کتاب میں جابجا انگریزی ناولوں کے حوالے تھے جن کے باعث مجھے انگریزی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔''(ہفت روزہ نصرت ،لاہور، 11 ستمبر 1960،صفحہ 60)

ان اکابر اساتذہ کی مختلف ادبی کتب پڑھنے سے ایک طرف تو مطالعے کا شوق پیدا ہوا دوسرا تنقیدی شعور بھی پختہ ہوتا چلا گیا۔1930 میں وقارعظیم صاحب نے ایک افسانہ''پریم رس'' تحریر کیا جو ''ادب'' لکھنؤ میں شائع ہوا۔اس کے بعد دس بارہ مزید افسانے تحریر کیے جو اس وقت کے مشہور رسائل ''ساقی''،''نیرنگ خیال''،''عالمگیر'' میں شائع ہوئے۔ایف۔اے کے دوران ہی افسر میرٹھی سے بھی کسبِ فیض کرنے کا آپ کو موقع ملا۔جو آپ کو شاعری کا پرچہ پڑھاتے تھے۔خود بھی شعروسخن سے خاصی دل چسپی رکھتے تھے،انھی دنوں لکھنؤ کے مختلف مشاعروں میں شرکت کرنے کا بھی موقع ملا۔بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔یہاں پر آپ کو مسعود حسین رضوی اور مولوی محمد حسین جیسے قابل اساتذہ سے فیض

یاب ہونے کا موقع ملا۔ 1932 میں آپ نے ایم۔اے اُردو کرنے کا فیصلہ کیا۔لکھنؤ یونیورسٹی میں اس وقت ایم۔اے اُردو کی کلاسوں کا اجرا نہیں ہوا تھا۔اس لیے آپ نے 1933 میں مسعود حسین رضوی کے ایما پر الہ آباد یونیورسٹی میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ یہاں پہنچ کر اپنی معاشی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے رام نرائن لال ناشر کی دوکان پر ایف۔اے کے فارسی نصاب کی کتاب کے انگریزی ترجمے کا کام کیا۔ابتدائی آٹھ صفحات لکھ کر آپ نے ناشر کو دیے تو اُس نے ترجمہ اُردو کے پروفیسر ڈاکٹر اعجاز حسین کو دکھایا جنھوں نے اسے پسند کیا یوں اُنھیں پبلشر سے زیادہ کام ملنے لگا۔اُنھی دنوں وقار صاحب نے انڈین پریس میں بھی کام کیا۔ایم۔اے کے دوران آپ کو ڈاکٹر ضامن علی، ڈاکٹر حفیظ سید، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر زبیر احمد، نسیم الرحمان، مولوی محمد علی اور فراق گورکھپوری جیسے عالم اساتذہ سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ساتھ ہی آپ کو دوست بھی بہت اچھے میسر آئے جن میں طالب الہ آبادی، صغیر احمد جان، سید احتشام حسین، حامد بلگرامی، پروفیسر احمد علی اور ڈاکٹر اشرف شامل تھے۔فرصت کے اوقات ڈاکٹر اعجاز حسین، سید جالب دہلوی، شوکت تھانوی، نیاز فتح پوری، حامد اللہ افسر وغیرہ سے ملاقاتیں کرتے اور ان کی علمی وادبی باتوں سے فیض اُٹھاتے۔مجلس معین الادب کے زیر اہتمام مشاعروں میں شرکت کرتے۔ان مشاعروں میں نامور شعرا سائل دہلوی، جوش، فانی، حسرت، اصغر، جگر، اثر لکھنوی، ظریف، ثاقب، بےخود، رواں اور سید آل رضا شریک ہوتے تھے۔

اسی دوران آپ نے مختلف ادبی رسالوں نیرنگ خیال، ہمایوں، ساقی، ادبی دنیا، عالمگیر، ہندوستانی، معارف، الناظر اور نگار میں مضامین لکھے۔بعض انگریزی مضامین کا ترجمہ بھی کیا۔ساتھ ہی مغربی ادب سے شناسائی پیدا کی اور سجاد ظہیر، فراق گورکھپوری، پروفیسر احمد علی کی رہنمائی میں لائبریری سے لارنس، جوائس، موپساں اور چیخوف کے افسانے پڑھے۔ 1934 میں سید وقار عظیم نے ایم۔اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔الہ آباد یونیورسٹی کا یہ قاعدہ تھا کہ فرسٹ آنے والے طالب علم کو وظیفہ دیا جاتا تھا جو ریسرچ ورک کے لیے ہوتا تھا۔سید وقار عظیم کی بھی اس وظیفے کے لیے منظوری ہوگئی۔ آپ کے مقالے کا موضوع تھا ''اُردو کی شاعری پر مقامی اثرات'' اصل میں یہ موضوع انگریزی میں تھا۔ Influance of Environment on Urdu Poetry پہلے مقالے انگریزی میں لکھے جاتے تھے۔اسی سال طلبہ کو اُردو میں لکھنے کی اجازت ملی۔ایک سال کے اندر آپ نے یہ تحقیقی مقالہ لکھا، صدر شعبہ اُردو ضامن صاحب نے اسے پسند کیا اور پھر انھی کی سفارش پر آپ کو پی۔ایچ۔ڈی کی

اجازت مل گئی، تاہم ڈاکٹریٹ کی خواہش پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی کیوں کہ ایم۔اے کرنے کے چھ مہینے بعد 1935 میں آپ کی دوسری والدہ کا انتقال ہوگیا اور دو مہینے بعد مئی 1935 میں والد مقبول عظیم بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔والدین کی اس ناگہانی موت نے سید وقار عظیم کے کندھوں پر معاش کی بھاری ذمہ داری ڈال دی۔بہن بھائیوں کی تعلیم، پرورش، شادی بیاہ سب آپ کے ذمے تھا کیوں کہ آپ گھر میں سب سے بڑے تھے۔لہٰذا اب آپ کی ساری توجہ اس بات پر تھی کہ اپنی گزر اوقات کے ساتھ ساتھ ان کے اخراجات بھی پورے ہوسکیں۔ایم۔اے کے بعد الہ آباد یونیورسٹی کے اُستاد ڈاکٹر حفیظ سید چھٹی پر انگلستان گئے، ان کی جگہ چھ مہینے کے لیے سید وقار عظیم کا تقرر ہوا اور اس عرصے میں آپ نے بی۔اے اور بی۔اے آنرز کی کلاسوں کو پڑھایا۔ڈاکٹر حفیظ سید کے آنے سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔دورانِ طالب علمی آپ کی دو کتابیں ''افسانہ نگاری''، اور ''ہمارے افسانے'' بھی چھپ چکی تھیں۔ساتھ ساتھ ترجمے کا کام بھی جاری رکھا اور کچھ درسی کتابیں بھی لکھیں۔بعض درسی کتابیں منظور بھی ہوئیں اور یہ انڈین پریس کے رام نرائن لعل نے شائع کیں۔ایچ۔جی ویلز کی کتاب ''اے شارٹ ہسٹری آف دی ورلڈ'' کا ترجمہ بھی کیا۔''بچوں کی دنیا'' رسالہ کی ادارت بھی آپ نے کی۔ساتھ ہی رسالہ ''سکاؤٹ'' کی ادارت کی۔رسالہ ''نیساں'' کے ایڈیٹوریل بورڈ کے رکن بھی رہے۔اسی دوران سید وقار عظیم کی ملاقات خواجہ غلام السیدین سے ہوئی، جو اس وقت ٹریننگ کالج علی گڑھ کے پرنسپل تھے، ان کی تحریک پر وقار عظیم صاحب نے بی۔ٹی کیا۔ٹریننگ کالج سے بی۔ٹی کرنے کے بعد سید وقار عظیم واپس الہ آباد آ گئے اور پھر تلاش معاش شروع کی۔

انھی دنوں خواجہ غلام السیدین کا خط اُن کے نام آیا جس میں ذکر تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین یورپ گئے ہیں اور جاتے ہوئے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اگر شعبہ اُردو کے لیے سید وقار عظیم جامعہ ملیہ آ جائیں تو اچھا ہو۔سیدین صاحب نے مزید لکھا کہ اگر آپ جامعہ جانا چاہتے ہیں تو وہاں یہ خط لے کر جایئے اور مجیب صاحب سے مل لیجیے۔بی۔ٹی کے دوران وہ ایک مرتبہ وقار صاحب کو جامعہ ملیہ دکھلا لائے تھے۔جہاں کا ماحول دیکھ کر سید وقار عظیم بہت متاثر ہوئے تھے۔لہٰذا جب انھیں سیدین صاحب کا یہ خط ملا تو بے حد خوش ہوئے اور باقاعدہ طور پر 1938 میں جامعہ ملیہ میں پڑھانا شروع کر دیا۔اسی دوران اُن کی شادی آگرے کے کوتوال عابد حسین خان کی صاحبزادی عابدہ بیگم سے 27 دسمبر 1938 کو لکھنؤ میں ہو چکی تھی۔(ثمرین اختر، سید وقار عظیم بحیثیت اقبال شناس، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔فل، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، 2006۔صفحہ 22)

جامعہ ملیہ میں وقار عظیم صاحب کی تنخواہ ساٹھ روپے مقرر ہوئی، لیکن تنخواہ پوری نہ دی جاتی بلکہ اس کا دو تہائی حصہ ملتا یعنی چالیس روپے، باقی پیسے اس لیے کاٹ لیے جاتے کہ ان دنوں جامعہ ملیہ کی حالت خاصی مخدوش تھی ۔ مجیب صاحب کے کہنے پر آپ نے اہل خانہ کو بھی ساتھ رکھنے کی حامی بھر لی اور چالیس روپے کرائے پر مکان حاصل کر لیا اور ساتھ ہی بیگم کو لینے آگرہ روانہ ہو گئے ۔ جامعہ ملیہ میں سید وقار عظیم 1938 سے 1942 تک رہے، کہتے ہیں:

''یہ پانچ برس ،میری زندگی میں ایک طرح سے خاصی اہمیت رکھتے ہیں یہاں میں نے ایک خاص قسم کی تربیت حاصل کی ،اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں کوئی ایسا کام نہ تھا جسے کرنے میں عار نظر آئے یا جو ایک پروفیسر کے شایان شان نہ ہو ۔ اکثر اوقات مالی پریشانیاں بھی تنگ کرتیں مگر کیا مجال جو ماتھے پر ذرا شکن آئے ۔'' (سید وقار عظیم ، سوانحی خاکہ، صفحہ 42)

جامعہ میں بی ۔ اے تک کلاسیں پڑھائی جاتی تھیں ۔ وہاں تین درجے تھے، ابتدائی، ثانوی اور کالج ۔ سید وقار عظیم کا تقرر ثانوی درجے میں ہوا ۔ تاہم ایک سال کے بعد دو کلاسیں کالج کی بھی مل گئیں ۔

''جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نام بڑا تھا ،لیکن اس کی اس زمانے میں مالی حالت ناگفتہ بہ تھی ۔ یہاں کے کسی اُستاد کو سوا سو روپے سے زیادہ مشاہرہ نہیں ملتا تھا ۔ سید وقار عظیم کو بھی جو تنخواہ ملتی تھی ، وہ ان کی ضرورتوں کے لیے ناکافی تھی ۔ لیکن آدمی تھے متحمل مزاج اور ایثار والے ،اس لیے کسی سے شکایت بھی نہیں کی ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (مرحوم شیخ الجامعہ (ف :مئی 1969) نے خود ہی ایک دن کہا کہ اگر آپ چاہیں تو کسی دوسری جگہ ملازمت کا انتظام کر لیں، تا کہ آپ کی مالی دشواریاں بھی کچھ کم ہو جائیں اور لکھنے کے شوق کی تسکین بھی ہو ۔ پھر ذاکر صاحب نے خود ہی نواب زادہ لیاقت علی خان (ف :اکتوبر 1951) صدر مجلس انتظامیہ اینگلو عربک کالج سے سفارش کی (ذاکر صاحب خود اس کے نائب صدر تھے) اور وقار عظیم اس کالج میں اُردو کے اُستاد مقرر ہو گئے ۔ اس کے چند دن بعد دہلی پالی ٹیکنیک میں اُستاد اُردو کی جگہ نکلی ۔ وہاں کے اصحابِ مجاز نے وقار عظیم کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی، مشاہرہ بھی زیادہ تھا اس پر وہ اینگلو عربک کالج سے مستعفی ہو کر وہاں چلے گئے ۔'' ('' سید وقار عظیم ، پروفیسر'' مطبوعہ

سہ ماہی تحریر علمی مجلہ دلی، مرتبہ مالک رام ، جلد: 11 ، شمارہ: 1 ، جنوری مارچ، 1977 ،صفحہ 111)

یہاں آپ نے 1942 سے 1946 تک کام کیا۔ 1946 میں آپ کو حکومتی پرچے'' آج کل '' دہلی کا مدیر بنا دیا گیا۔ یہاں آپ کو پولی ٹیکنیک کی تنخواہ سے تین گنا زیادہ رقم دی گئی۔ ہوا کچھ یوں کہ '' آج کل'' میں سید وقار عظیم صاحب کے دوست اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے، انھیں اس شرط پر ترقی مل رہی تھی کہ وہ اپنا کوئی بدل رکھ دیں، ان کے ذہن میں سید وقار عظیم کا نام آیا، وقار صاحب نے یہ عذر پیش کیا کہ میں سرکاری ملازم ہوں اس لیے عرضی نہیں دے سکتا تاہم انھوں نے کہا کہ آپ صرف انٹرویو دے دیں، اور منتخب ہونے کی صورت میں استعفیٰ دے دیجیے گا، چناں چہ ایسے ہی ہوا اور یوں انھوں نے '' آج کل'' کی نوکری قبول کر لی۔ اس سارے عرصے میں مصروفیت کے باعث سید وقار عظیم ادبی مصروفیات سے کنارہ کش رہے تاہم اُن کا حلقۂ احباب وسیع ہو گیا۔ پطرس بخاری کی قائم کردہ مجلس اور ترقی پسند تحریک کے مختلف اجلاسوں میں آپ لازمی شرکت کرتے۔ اس طرح ادب سے رشتہ ٹوٹا نہیں بلکہ قائم رہا اور تاثیر، فیض، چراغ حسن حسرت، حفیظ جالندھری، حمید احمد خان، حامد علی خان، کیپٹن عبدالواحد، ممتاز حسین، اے ڈی اظہر، کرشن چندر، منٹو، میرا جی، شاہد احمد دہلوی، رازق الخیری اور صادق الخیری، فضل حق قریشی، انصار ناصری، مرزا محمد سعید سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، اسی دوران 1947 میں تقسیم ہند ہوئی۔ سارے سرکاری ملازمین سے پوچھا گیا کہ وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان، اس پر رسالہ '' آج کل'' کے سارے عملے نے پاکستان کے حق میں رائے دی یوں یہ سب لوگ کراچی آ گئے، ہندوستان میں رسالہ '' آج کل'' پبلی کیشنز ڈویژن انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کے زیرِ انتظام تھا۔ اس لیے اس عملے کو پاکستان آنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔

> ''سرکاری ملازم کی حیثیت سے مجھے اپنا سامان لانے کی جو سہولت ملی تھی، اس کی بدولت چھوٹی بڑی بہت سی چیزیں بحفاظت پاکستان پہنچ گئیں۔'' (معین الرحمان سید، شخصیات وادبیات میرا کتب خانہ: ایک گفتگو، لاہور: مکتبہ عالیہ، 1995، صفحہ 1971)

12 اگست 1947 کو سید وقار عظیم کراچی پہنچے۔ یہاں آکر حکومت نے پرچہ '' ماہِ نو'' نکالنے کا فیصلہ کیا اور وقار صاحب اس کے پہلے ایڈیٹر بنے اور 1950 تک اس عہدے پر فائز رہے۔ بقول

ڈاکٹر اعجاز حسین:

''سرکاری جرید ے کی ابتدا دونوں مملکتوں میں ان ہی کے ہاتھوں سے ہوئی۔''

(اعجاز حسین، ڈاکٹر مختصر تاریخ اُردو، کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، 1971)

ان مصروفیات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک وقار عظیم ''آج کل'' اور ''ماہِ نو'' میں رہے ان کا تصنیفی و تالیفی کاموں کا سلسلہ منقطع رہا۔ کراچی کی آب وہوا بھی سید وقار عظیم کو راس نہ آئی اور انھیں سانس کی تکلیف (دمہ) ہو گئی اور ڈاکٹروں نے کراچی چھوڑ کر لاہور جانے کا مشورہ دیا۔ اسی اثنا میں آپ کو پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے شعبہ اُردو میں بطور اُستاد لینے کی پیش کش ہوئی۔ یوں 2 فروری 1950 کو لاہور پہنچے۔ 4 فروری 1950 کو آپ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں بطور ریڈر وفیسر تعینات ہوئے۔ اے حمید نے ان دنوں کی روداد ''سنگ دوست'' میں تفصیل سے رقم کی ہے:

''وقار صاحب کلاس میں داخل ہوتے تو مسکرا رہے ہوتے۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر لیکچر دیتے۔ اُردو افسانے پر ان کے لیکچر آج بھی یاد آتے ہیں۔ معلوم ہوتا کہانی سنا رہے ہیں۔ داستان پڑھ رہے ہیں۔ ذرا خاموش ہوتے تو کلاس روم کی یہ خاموشی اور زیادہ گمبھیر ہو جاتی۔ بڑی خاموشی اور بڑا سکون ہوتا تھا۔ کلاس روم کی کھڑکی کے باہر برگد کے شاخوں کی نئی سرخ کونپلیں بہار کی سنہری دھوپ میں چمک رہی ہوتیں۔ کوئی طالب علم ان کونپلوں کی طرف دیکھتا تو وقار صاحب کبھی منع نہ کرتے۔ انھیں معلوم تھا کہ درخت بھی لیکچر دیتے ہیں اور کبھی کبھی ان کا لیکچر بھی ضرور سننا چاہیے۔'' (اے حمید، سنگِ دوست، جودت پبلی کیشنز، لاہور 1984، صفحہ 336)

اورینٹل کالج میں ادبی و علمی، تحقیقی کاموں میں منہمک رہنے میں آپ بہت راحت محسوس کرتے تھے۔ اپنی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''زیادہ کوشش یہی رہتی کہ انھیں چیزوں کا مطالعہ کیا جائے جو طلبہ کے لیے زیادہ مفید ہو سکیں۔ چناں چہ ان موضوعات پر نئی پرانی سب چیزیں نظر سے گزرتی رہیں۔ مضامین بھی زیادہ تر انھیں موضوعات پر لکھے۔ اُردو ادب اوڑھنا بچھونا بن چکا ہے۔ نئی نئی کتابیں آتی رہتی ہیں اور ان کا مطالعہ جاری رہتا ہے۔'' (سید وقار عظیم، سوانحی خاکہ، صفحہ 49)

اپنے اس تدریسی سفر کے دوران آپ نے بہت سی ادبی تخلیقات کو جنم دیا۔ ساتھ ہی اقبالیات سے

متعلق دو عظیم کتب سامنے آئیں۔

''فروری 1950 سے اورینٹل کالج لاہور میں پڑھانا شروع کیا تو قدم قدم پر کتابوں کی ضرورت پیش آئی اور یونیورسٹی کے کتب خانے اس ضرورت کو رفع کرتے رہے،اب حال یہ ہے کہ میرے گھر کے ہر کمرے میں، برآمدے میں، گیلری میں کتابیں ہی کتابیں ہیں اور جو کمرہ میری خواب گاہ ہے اور لکھنے پڑھنے کا کمرہ بھی اچھی خاصی کباڑی کی دکان بن گیا ہے۔''(معین الرحمان سید، ڈاکٹر شخصیات وادبیات، صفحہ 105)

آپ کے ذاتی ذخیرہ کتب میں لغات ،تاریخی کتابیں ،شعرا کے دیوان ،افسانے ،ناول تمام بڑے اُردو شاعروں غالب ،میر کے دیوان ،مغربی ادب ،رسائل غرضیکہ کبھی کچھ موجود ہے ۔اورینٹل کالج کی ملازمت کے دنوں میں حکومت کی طرف سے رسالہ ''نقوش'' پر کچھ پابندیاں عائد تھیں ۔محمد طفیل کے کہنے پر آپ نے اُس وقت اعزازی طور پر ''نقوش'' کی ادارت سنبھالی اور شمار نمبر 11 سے 18 شماروں تک بحثیت مدیر فرائض سرانجام دیے۔

1962 میں آپ نے رسالہ ''اُردو''، کراچی ، کے''بابائے اُردو نمبر'' کی ادارت بھی کی ۔1965 میں آپ کو صدر شعبہ اُردو (پنجاب یونیورسٹی)مقرر کیا گیا ۔اسی سال آپ عارضی طور پر پرنسپل پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے منصب پر بھی فائز رہے ۔سید وقار عظیم پاکستانی اہل قلم کے ایک وفد کے رکن کی حیثیت سے اپریل 1966 میں ایک مختصر سے خیر سگالی دورے پر چین تشریف لے گئے ۔جہاں چین کے ممتاز اہل قلم اور حکام نے پاکستانی ادیبوں کا گرم جوشی سے استقبال کیا ۔جمہوریہ چین کے صدر نے بھی اس وفد کو باریابی کا شرف بخشا ۔وزیر خارجہ مارشل چن ژی سے اس وفد کی دو گھنٹے ملاقات ہوئی اس دورے کے دوران آپ نے چین کے سکولوں کا بھی دورہ کیا اور ایسے چینی اساتذہ سے ملے جو اُردو بلکہ اچھی خاصی اُردو جانتے تھے ۔ پیکنگ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اُردو سے بھی ملے ۔وہاں ایک غیر رسمی محفل میں سید وقار عظیم کو فلسفہٗ اقبال پر تقریر کرنے کا موقع ملا ۔چین کے شہروں'' پیکنگ'' اور ''شنگھائی'' کے کتب خانے بھی دیکھے ۔آپ نے تقریباً تین ہفتے وہاں قیام کیا ۔اس سفر کے دوران ڈاکٹر وحید قریشی، اعجاز حسین بٹالوی، پیر حسام الدین ، ابن انشاء آپ کے ہمراہ تھے ۔(پروفیسر سید وقار عظیم کے دورہ چین کے تاثرات، صفحہ 89)

''1969 میں غالب کی صدی کے موقع پر ، پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ اُردو

میں کرسیٔ غالب،(غالب چیئر) قائم ہوئی،پہلا غالب پروفیسر شپ،سید وقارعظیم کو ملا جس پر آپ اپنی ریٹائرمنٹ 1970 تک فائز رہے۔"(نقوش،لاہور،جنوری 1977،صفحہ 607)

سید وقارعظیم پنجاب یونیورسٹی کے ادارہ تالیف وترجمہ سے بھی منسلک رہے۔جو 1964 میں قائم ہوا۔آپ کے دور میں طبعیات،معاشیات،سیاسیات،فلسفے اور نفسیات کی اصطلاحات وضع ہوئیں جو کتابی شکل میں بھی چھپیں۔سید وقارعظیم کو ادارے کی طرف سے ڈھائی سو روپے ماہوار الاؤنس ملتا تھا۔ 1970 میں آپ ریٹائر ہوئے۔ریٹائرمنٹ سے دو تین مہینے پہلے آپ نے ادارے کو خط لکھا کہ چوں کہ یہ ادارہ انھوں نے قائم کیا ہے اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ بعد میں بھی بلاکسی معاوضے کے اس سے متعلق رہیں۔تاہم ایسا ہو نہ سکا البتہ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ Visiting Professor کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی سے منسلک رہے۔ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے اقبال پر ایک کتاب "اقبال معاصرین کی نظر میں" تالیف کی۔1973 میں یہ کتاب منظر عام پر آئی۔ملازمت سے سبکدوشی کے بعد آپ کی مصروفیات کا سلسلہ ختم نہ ہوا بلکہ بڑھتا چلا گیا۔آپ بیک وقت بہت سے اداروں کے رکن،نگران اور مشیر تھے۔آپ مجلس ادارت تاریخ ادبیات اُردو پنجاب یونیورسٹی کے رکن رہے۔نصاب ساز کمیٹی حکومت کے رکن بھی رہے۔1965 سے آپ بزم اقبال لاہور کی مجلس عاملہ کے رکن بھی چلے آرہے تھے۔1974 میں اقبال اکیڈمی کراچی کے خازن ڈاکٹر نذیر احمد کا ایکا یک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ان کی جگہ آپ کو کمیٹی کا خازن مقرر کیا گیا۔

1974 سے لے کر 1976 تک آپ کی مصروفیات کا مرکز محور صرف اقبال ہی تھے۔دن رات میٹنگ،مجالس میں شرکت،مضامین لکھنے کا کام،مشاورتی اجلاس،ظاہر ہے یہ تمام امور صحت اور تندرستی مانگتے ہیں۔لیکن سید وقارعظیم ایک طویل عرصے سے بیمار چلے آرہے تھے اور اب علالت طویل ہوتی جارہی تھی۔

سید معین الرحمان فرماتے ہیں:

"6 نومبر 1976 کی اس شب۔۔۔جب وہ ہمیں رخصت کرنے باہر تشریف لائے تو فرمایا کہ اگلی اتوار 14 نومبر کو ضرور آیئے تاکہ سلسلۂ اقبال کے ان پھیلے ہوئے کاموں کو نمٹایا جا سکے۔وقت رخصت فرمان صاحب سے ہاتھ ملایا۔معاً مجھ سے بھی مصافحہ کیا یہ میرے لیے خلاف معمول تھا۔مجھے عجب بے چینی کا احساس ہوا۔اس

وقت کیا خبر تھی کہ اس ملاقات اور لمس کی یاد ہی ،ان سے ہوش وحواس کی آخری بات
اور آخری یاد ہو کر رہ جائے گی ۔" (معین الرحمان ،سید ،شخصیات وادبیات
(سیدوقارعظیم کے آخری ایام)صفحہ 113)

8 نومبر کو وقار عظیم صاحب پہلی فلائیٹ سے ملتان تشریف لے گئے ۔اسی روز شام کی فلائیٹ سے واپس آ گئے ۔ہمراہ ان کے ڈاکٹر عبادت بریلوی تھے ۔سفر کی تھکن نے طبیعت پر برا اثر ڈالا ۔چناں چہ آپ 9 نومبر کو اقبال اکیڈمی کے زیر اہتمام "یوم اقبال" کی میٹنگ میں تشریف نہ لے جا سکے۔ 10 نومبر کو وہ مجلس زبان دفتری کے اجلاس (منعقدہ پنجاب اسمبلی)میں شریک ہوئے ۔11 نومبر کی صبح کو بھی وضع اصطلاحات کی میٹنگ کے لیے پنجاب اسمبلی تشریف لے گئے اور سارے کام دلجمعی سے کرتے رہے ۔اس شب پیشاب بند ہو جانے کا احساس ہوا ۔میٹنگ سے پندرہ بیس منٹ پہلے اُٹھ گئے اور ڈاکٹر سے معائنہ کروایا ۔اختر وقار عظیم ساتھ تھے انھوں نے ہسپتال داخل ہونے کا مشورہ دیا ۔ گھر والوں پر کوئی پریشانی ظاہر نہ کی یہی کہا کہ ذرا سی تکلیف ہے ایک دو دن ہسپتال میں رہنا ہوگا ۔ 11 نومبر جمعرات کے روز فرید کوٹ ہاؤس مزنگ روڈ پر واقع فیملی ہاسپٹل میں داخل ہوئے ۔ابتدائی تشخیص کے بعد Prostrate Gland ،لیور کی خرابی اور یرقان کے شدید حملے کا پتہ چلا ۔12 نومبر کو جمعے کے روز فیملی ہاسپٹل سے ہاجرہ میموریل کلینک میں منتقل ہو گئے ۔13 نومبر کو بہتر تھے ،اچانک رات دس بجے معدے میں شدید درد کی شکایت ہوئی جو بے ہوشی میں تبدیل ہوتی چلی گئی ۔ڈاکٹر خلیل نے بتایا کہ یرقان کا شدید حملہ ہے ،میو ہسپتال لاہور کے پروفیسر ڈاکٹر عالمگیر سے رجوع کیا گیا ۔معائنے کے بعد انھوں نے خون کی تبدیلی کا مشورہ دیا ۔چودہ گھنٹے کے بعد خون کی تبدیلی کا عمل مکمل ہوا ۔لیکن غذا دینے کے بعد معدے سے خون آنا شروع ہو گیا ۔بدھ 17 نومبر کی شام سات بج کر تینتیس منٹ پر یہ عظیم شخصیت اس دارفانی سے رخصت ہو کر راہیِ ملکِ عدم ہو گئی ۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

18 نومبر دن گیارہ بجے میانی صاحب لاہور میں آپ کی تدفین عمل میں آئی ،منظور حسین عباسی نے ہجری میں تاریخ کہی:

ازاں کی ہر نفش بودہ فیض بارِ عظیم
تراوش قلمش گشتہ شاہکارِ عظیم

چو رخت بست زدنیاے : ولیٔ گفت احسن

زسالِ رحلت او"نوحہ وقار عظیم"(1396)

("سید وقار عظیم، پروفیسر"مطبوعہ سہ ماہی تحریر، دہلی، مرتبہ مالک رام، جلد: 11 شمارہ: 1 جنوری مارچ 1977، صفحہ 113)

ب) شخصیت:

پروفیسر وقار عظیم ایک جامع الصفات مرنجانِ مرنج اور بہت وضع دار انسان تھے۔ان کے ذکر سے ہی ان کی وہ دل کش، سنجیدہ اور سراپا شفقت شخصیت سامنے آجاتی ہے جس میں علم کا تدبر، تجربے کی پختگی، محبت اور شائستگی کا بلند معیار نظر آتا تھا۔پہلی ہی ملاقات میں ملنے والوں کو ان سے قربت کا احساس ہونے لگتا تھا۔سید اقبال عظیم، وقار عظیم کے شخصی حلیے کو یوں بیان کرتے ہیں۔

> "دراز قد، تناسب اعضا اور اچھے ہاتھ پیروں کے باوجود، بے حد دبلا پتلا بدن، کشادہ پیشانی اور ذہین آنکھوں کے باوجود بے آب و تاب اور جھریوں دار چہرہ اور بھرپور علمی وصلاحیت کے باوجود رفتار و گفتار میں انتہا درجہ کی سادگی اور عجز۔"
>
> (سید وقار عظیم، سوانحی خاکہ، صفحہ 99)

سید وقار عظیم نے کبھی سوٹ نہیں پہنا، ہمیشہ مشرقی لباس ہی زیب تن کیا۔اقبال عظیم اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "شیروانی، علی گڑھ کٹ پاجامہ اور اکہرے کالر کی قمیض ہمیشہ سے ان کا لباس ہے، جس میں موسم سرما صرف مفلر کا اضافہ کر دیتا ہے۔"(پروفیسر سید وقار عظیم، سوانحی خاکہ، صفحہ 100)

انتظار حسین لکھتے ہیں:

> "جس طرح بعض ادیب سائیکل سے شروع ہوئے اور اب کار میں بیٹھتے ہیں۔اسی طرح کتنے ہی ادیب شیروانی سے شروع ہوئے تھے اور اب سوٹ میں ملبوس نظر آتے ہیں۔مگر سید وقار عظیم ایک وضع داری کے ساتھ شیروانی کے ساتھ نبھائے جا رہے ہیں اور شیروانی بھی اس چھریرے بدن سے ایسی مانوس ہوئی ہے کہ اس رکھ رکھاؤ والی شخصیت کا حصہ بن

گئی ہے۔"(ماہِ نو، لاہور، مئی 1978 (سید وقار عظیم نمبر)، صفحہ 45)

ہمیشہ دوسروں کی عزتِ نفس کا خیال رکھنا، دوسروں کے مفاد کے لیے اپنے فائدے کو ترک کر دینا، جان بوجھ کر دھوکہ کھا لینا، غرضیکہ وقار صاحب نہایت سادہ طبیعت کے مالک تھے۔ دوسروں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ خانگی زندگی میں بھی آپ اپنے سب بہن بھائیوں سے بالکل مختلف تھے۔ والدین کے ساتھ بھی نہایت عاجزی اور ادب سے پیش آتے۔ اُن کے چھوٹے بھائی اقبال عظیم لکھتے ہیں:

"ہماری دوسری والدہ گو ہماری سگی خالہ تھیں ...... کبھی ہمیں، کبھی اُن کو ہم سے شکایات رہنے لگیں ...... لیکن اس وقت بھی بھائی صاحب کے نزدیک گویا گھر کی فضا پہلے کی طرح خوشگوار تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ والدہ صاحبہ کی Good Books میں شامل تھے۔ بلکہ وہ انھیں اپنا کماؤ بیٹا اور اللہ میاں کی گائے کے ناموں سے یاد کرتی تھیں ان کی صورت دیکھ کر باغ باغ ہو جاتی تھیں۔ چناں چہ انتقال کے وقت بھائی صاحب کے نام کا وظیفہ ان کی زبان پر تھا، اُن ہی کے زانو پر والدہ صاحبہ نے دم توڑا۔"(سید وقار عظیم، سوانحی خاکہ، صفحہ 103)

سید وقار عظیم نے اپنی پہلی تصنیف بھی والدہ صاحبہ کے نام سے معنون کی۔ صرف والدین نہیں بہن بھائی سے بھی ہمیشہ شفقت و محبت سے پیش آتے۔ یہی نہیں بلکہ اساتذہ اور دوست احباب بھی آپ کے مداح تھے۔ شوکت تھانوی، سید وقار عظیم کی ظاہری وضع قطع کے متعلق لکھتے ہیں:

"وقار عظیم صاحب کالج میں پروفیسر ہیں مگر ادائیں طالب علمانہ ہیں، دھان پان جسم بھی عجیب کلک نما پایا ہے، ہر وقت ہنسنے والی آنکھیں اور ان آنکھوں میں اپنے مخاطب کے لیے چمک۔ ہوا کا تیز جھونکا آ جائے تو یہ نقاد اُڑ جائے، مگر کسی ادبی بحث میں حصہ لے تو معلوم ہو کہ یہ وقار عظیم نہیں بلکہ ایک کوہ وقار ہے جو اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتا۔"(قاعدہ بے قاعدہ، صفحہ 105)

بڑی شخصیات کا یہی خاصا ہے کہ وہ اپنے اصولوں پر قائم رہتی ہیں۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی بھلائی کا خیال رکھتی ہیں۔ سید وقار عظیم بھی ہمیشہ دوٹوک اور صاف بات کہنے کے عادی رہے۔ ڈاکٹر معز الدین لکھتے ہیں:

"کئی بار مجلس منتظمہ کی میٹنگ میں شرکت کے لیے آئے۔ اس وقت ان کی معارف

پروری، رواداری، عنایت وشفقت کے جوہر سامنے آئے ۔فیصلے دوٹوک ۔بات
کھری،مشورے صائب،صاف ذہن،صاف قلب اور روشن دماغ کے مالک تھے ۔''
(سہ ماہی''الاقربا،اسلام آباد، جولائی تمبر 2004،صفحہ 84)

سید وقار عظیم ان خوش نصیب ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں ۔جن کے فن کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں کیا گیا ۔آپ کو اپنے دورِ طالب علمی ہی سے بے حد پذیرائی حاصل ہوئی ۔اساتذہ کی داد و تحسین بھی شامل حال رہی ۔اس کے بعد اخبارات رسائل میں ان کی شخصیت پر متعدد مضامین شائع ہوتے رہے۔سید معین الرحمان کے نزدیک سید وقار عظیم صاحب کی شخصیت پر سب سے پہلا مضمون سب ایڈیٹر ''آج کل'' مظفر شاہ خان کا ہے جو 1943 میں رسالہ''ساقی'' دہلی کے ایک شمارے میں شائع ہوا۔

سید وقار عظیم زمانہ سازی اور حیلہ جوئی سے بالکل پاک تھے ۔دوسروں کے بھلے کے لیے جان بوجھ کر دھوکا بھی کھا لیتے تھے جس کا انھیں بعد میں پچھتاوا کبھی نہ ہوا۔تحمل، رواداری اس قدر کہ ہر مزاج کا آدمی اِن سے خوش، اور یہ اُن سے خوش، کبھی کسی سے خفا نہ ہوئے ۔

''ساری زندگی انھوں نے فریب کھایا ہے اور ایسا کھایا ہے کہ قدم قدم پر انھیں اپنی
زندگی کی راہیں بدلنا پڑی ہیں ۔لیکن جن لوگوں نے انھیں فریب دیا، آج بھی اُن سے
متنفر نہیں ہیں بلکہ جب بھی موقع ہوتا ہے زبان وقلم سے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف
کرتے ہیں ۔''(سید وقار عظیم، سوانحی خاکہ، صفحہ 103)

ڈاکٹر اعجاز لکھتے ہیں:

''لکھنا پڑھنا ان کا اوڑھنا بچھونا ہے، جب لکھنے پر آتے ہیں تو نہ کسی ماحول کی ضرورت
محسوس کرتے ہیں اور نہ سکون کی فکر کرتے ہیں، ان کا قلم ہر حال میں چلتا ہی رہتا ہے،
چاہے شور وغل ہو یا لوگ پاس بیٹھے ہوں، دوسرے تفریحات میں مصروف ہوں ان کو
اپنے کام سے کام، وہ ایک روزنامہ اخبار کے ایڈیٹر کی طرح لکھتے وقت ساری دنیا سے
بے نیاز ہو کر فوراً سب کچھ لکھ جاتے ہیں ۔''(اعجاز حسین ، ڈاکٹر، مختصر تاریخ ادب
اُردو، صفحہ 391)

سید وقار عظیم کا حافظہ بہت اچھا تھا ۔کبھی نوٹس نہ لیتے، سب کچھ ذہن میں محفوظ کر لیتے اور بعد میں جب کبھی ضرورت محسوس ہوتی تو سب کچھ ذہن میں از خود تازہ ہو جاتا ۔کبھی اپنی لکھی ہوئی تحریر کی نقل پاس

نہ رکھتے تاہم یہ ان کی ذہانت تھی کہ اگر کبھی ان کو دوبارہ مضمون لکھنا پڑ جاتا تو پہلے جیسا ہی مضمون بالکل صحیح دوبارہ لکھ لیتے۔

> ''یوں بھی ہوا ہے کہ کسی مضمون کا عنوان کاغذ پر لکھا جا چکا ہے اور بھابھی صاحبہ نے کھانے کا نوٹس دے دیا ہے، اتنے میں کھانا لگ گیا تو جملہ جس جگہ ہے اسے اسی جگہ چھوڑ کر اور مضمون سے بالکل بے تعلق ہو کر ہنسی خوشی کھانا کھایا گیا اور شام کو تفریح کے لیے نکلنے سے پہلے مضمون ختم۔ یہ ان مضامین کا حال ہے جن سے بھائی صاحب بحیثیت ادیب پہچانے جاتے ہیں۔'' (سید اقبال عظیم، سید وقار عظیم، (سوانحی خاکہ) ص 108)

سید وقار عظیم نہایت وضع دار اور حلیم الطبع شخصیت کے مالک اور دھیمے مزاج کے آدمی تھے، برہم کم ہوتے تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں:

> ''سید وقار عظیم کے کردار کی ایک بات، ان کی خاص طرح کی وضع داری تھی، وہ کبھی غصے میں نہیں آتے تھے، کبھی تلخ اور تند بات نہیں کہتے تھے نتیجہ یہ ہے کہ ان کے بڑے بڑے مخالفین بھی (اگر وہ کوئی ہوں تو) کسی نہ کسی طرح ان سے مفاہمت ضرور کر لیتے تھے اور اس میں وقار عظیم صاحب کے کردار کا، ان کے خلوص کا اور ان کے انسانی پہلو کا دخل تھا اور یہ وہ چیز ہے جو بہت کم لوگوں میں ملے گی۔'' (اقبالیات کا مطالعہ، (حرفِ چند)

مشہور افسانہ نگار صادق حسین صاحب لکھتے ہیں:

''میں نے 22 سال کی رفاقت میں سید وقار عظیم کی زبان سے کسی کے خلاف بات نہیں سنی۔ اگر کوئی شخص اُن کی موجودگی میں کسی کے بارے میں نازیبا بات کرتا تو اسے نرمی سے ٹوک دیتے۔ میں جب بھی اُن کے کمرے میں داخل ہوا، اُنھیں کام کرتے پایا وہ تخت پر بیٹھ کے لکھتے تھے۔ اُن کے کمرے میں ہر چیز ایسی صاف ستھری ہوتی تھی کہ انسان دیکھا کرے۔ وہ کم خور و کم خواب تھے۔ ضرورت مندوں کی چپکے سے مدد کر دیتے۔ جو شخص ان کے پاس آتا، خالی ہاتھ نہ جاتا۔ وہ بصیرت افروز باتوں کے خزانے لے کر جاتا۔ میں نے انھیں اکثر جانماز پر سجدہ ریز دیکھا۔ انھیں رقت میں، خاموش دُعائیں مانگتے دیکھا۔ یہ معاملہ ان کا اور ان کے رب کا تھا۔ وہ رب جس نے انھیں انسانیت کا دوست بنا کر بھیجا

تھا۔ان کے ہونٹوں پر سرورِ کائنات کا نام آتا تو ان کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔انسان مر جاتا ہے انسان زندہ رہتا ہے۔سید وقار عظیم زندہ ہے۔اب بھی ان کی باتوں کی خوشبو آ رہی ہے۔

جو فیصلہ انسانی دل کرتے ہیں،وہ فیصلہ تاریخ بن جاتا ہے۔سید وقار عظیم ایک تاریخ ہے۔آنے والی نسلیں یہ تاریخ پڑھ کر محبت اور امن و آشتی کا درس لیں۔(صادق حسین،شفقت اور محبت کا دیوتا، مطبوعہ ماہِ نو،لاہور مئی 1978 صفحہ 35)

مذہبی معاملات کے حوالے سے اقبال عظیم فرماتے ہیں:

''انھوں نے شدت سے نمازیں بھی پڑھی ہیں اور کڑکڑاتے جاڑوں میں منہ اندھیرے سونے والوں کو ایک ایک کر کے فجر کی نماز کے لیے جگایا بھی ہے اور مسجد میں خود اذانیں بھی دی ہیں۔''(سید وقار عظیم،سوانحی خاکہ،صفحہ 103)

دوسرا رنگ یہ کہ تفریح طبع کے لیے تاش اور کیرم بھی کھیلے اور کثرت سے سنیما بھی دیکھا ہے۔بوائے سکاوٹنگ میں بھی دل چسپی رکھتے تھے۔مغربی ادب کے بھی شائق تھے۔شکار بھی شوق سے کھیلتے تھے اور بہت اچھے نشانہ باز بھی تھے۔آپ کی شخصیت میں بہترین معلم بھی موجود تھا اور بہترین رہنما بھی۔سید معین الرحمان لکھتے ہیں:

''وقار عظیم صاحب،اقبال کے اُس میر کارواں کی مجسم تصویر ہیں نگہ کی بلندی،سخن کی دل نوازی اور جاں کی پرسوزی کو جس کا رختِ سفر بتایا اور ٹھہرایا گیا ہے۔ان کی شخصیت میں بڑا گداز اور مٹھاس،بے حد دل کشی و دل ربائی اور بڑی تابانی و توانائی ہے۔''(سید وقار عظیم،سوانحی خاکہ،صفحہ 97)

زندگی کے آخری ایام میں آپ بے حد علیل تھے اس وقت بھی اپنے کام سے دل چسپی اور لگن مسلسل قائم تھی۔بیماری کے دنوں میں بھی آپ تصنیف و تالیف کے کاموں میں مصروف تھے۔مصروفیات کا یہ عالم تھا کہ جب آپ ہسپتال میں داخل ہوئے تب بھی اقبالیات سے متعلق بہت سی کتب آپ کے بستر پر تھیں۔ڈاکٹر معز الدین فرماتے ہیں:

''شام کو عیادت کے لیے گیا،گلوکوز چڑھایا جا رہا تھا،اسی سنجیدہ مسکراہٹ اور گرم جوشی سے پیش آئے،کہنے لگے کہ یرقان ہوگیا ہے،ٹھیک ہو جاؤں گا۔جب چلنے لگا تو پوچھا آج کل دستخط کے لیے چیک یا فائل نہیں بھیجتے۔میں نے کہا آپ کی صحت ٹھیک

ہو جائے تو ضرور بھیجوں گا۔بولے نہیں کاغذات بھیج دیں، میں تو امتحان کی کاپیاں اور اقبال پر کتابیں یہیں منگوا رہا ہوں۔ میں ان کی ہمت اور کام کی ذمہ داری کا قائل تو تھا ہی اور بھی متاثر ہوا۔اللہ رے فرض شناسی! بیمار ہو کر بھی آج کے کام کو وہ کل پر نہ ٹالتے۔کار دنیا کسے تمام نہ کرد، مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنا بیشتر کام نمٹا گئے۔ یہ دوسروں کے لیے سبق ہے کہ دیکھو اس طرح کام کرتے ہیں۔" (سہ ماہی الاقربا، اسلام آباد، جولائی ستمبر 2004 صفحہ 87)

سید وقار عظیم ان خوش نصیب افراد میں شامل ہیں جن کی خدمات کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں کر لیا جاتا ہے۔اپنی زندگی میں آپ نے بہت نیک نامی اور عزت پائی۔آپ کی خدمت کے اعتراف میں وقار صاحب کے نام سے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں "سید وقار عظیم گولڈ میڈل" کا اجرا کیا گیا، جو اب بھی باقاعدگی سے ہر سال دیا جاتا ہے۔ڈاکٹر سید معین الرحمان کے بقول سید وقار عظیم اسم با مسمّٰی کی مکمل اور بھرپور مثال ہیں۔

"وقار اور عظمت ان کا امتیاز اور اختصاص ہے۔وہ ذات میں معلّمین کی برگزیدگی کا اعتبار و افتخار یا علامت ہیں۔ان کے دم سے اس پیشے کی تقدیس و تحریم، وقار و آبرو اور معلم و متعلم کے رشتے کی مان دان سلامت ہے۔ترسیل علم، فن ہی نہیں فسون بھی ہے، وقار عظیم صاحب نے اسے سچ کر دکھایا ہے۔تدریس کو انھوں نے عبادت اور ریاضت کا ہم عناں و ہم معنی بنا لیا ہے اور یہ وہ منزل بلند ہے جہاں غالباً وہ تنہا بھی ہیں اور تصرف ذات کے اعجاز اور لحاظ سے پارس صفت کے حامل بھی۔" (معین الرحمان، سید، شخصیات و ادبیات (کچھ وقار عظیم صاحب کے بارے میں)، صفحہ 59)

"پروفیسر سید وقار عظیم کو تصور میں لایئے۔ایک وقت میں انھوں نے اُردو کی تنقید کو ایک نئی راہ دکھائی۔یہ بتایا کہ تنقیدی غور و فکر کی مستحق صرف شاعری ہی نہیں ہے افسانہ بھی اسی غور و فکر کا مستحق ہے۔یوں وہ اُردو تنقید میں فکشن کی تنقید کے معمار اول قرار پائے۔اپنے آخری زمانے میں ان کا رول دوسرا تھا۔ایک بزرگ ادیب کا جو رول ہوا کرتا ہے۔ہنگامہ پیدا کرنے نئی راہیں نکالنے کے بعد وہ وقت آتا ہے جب اس کا کام یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ جو ہو چکا ہے وہ ضائع نہ چلا جائے۔جو معیار قائم ہو چکے ہیں ان کا

تحفظ کیا جائے ۔تو اب وقار صاحب اسی مقام پر تھے ایک رکھ رکھاؤ، ایک وضع داری زندگی میں بھی تحریر میں بھی ۔جس رکھ رکھاؤ سے بولتے بات کرتے تھے ۔اسی رکھ رکھاؤ سے فقرہ لکھتے تھے ۔

وضع داری، طور طریقوں میں شائستگی، متانت مگر ساتھ میں ایک حس مزاح، گفتگو متانت کے ساتھ، اسی متانت کے ساتھ کوئی بر جستہ فقرہ، ہلکی مسکراہٹ۔ ایسے شخص کے ہوتے ہوئے یہ پتہ تو چلتا ہے کہ ظرافت کیا ہوتی ہے اور مزاح کسے کہتے ہیں ایسے شخص درمیان میں سے ہٹ جائیں تو مزاح اور پھکڑ پن میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ ابتذال ہی کو مزاح سمجھ لیا جاتا ہے ۔مزاح میں ایک شائستگی بھی ہوتی ہے یہ تصور ہی جاتا رہتا ہے ۔سو دیکھ لو کہ اس زمانے میں یہی ہو رہا ہے ۔

ایسے بزرگوں کے واسطے سے ہم اپنے گمشدہ معیارات کو واپس لا سکتے ہیں ۔کم از کم ہمیں یہ احساس تو رہتا ہے کہ معیارات کیا ہیں، ان معیارات کو نبھا سکیں یا نہ نبھا سکیں یہ الگ بات ہے ۔''(انتظار حسین، روزنامہ مشرق لاہور، 17 نومبر 1980)

☆☆☆☆

باب دوم:

سید وقار عظیم کے علمی آثار

سید وقار عظیم کی تصنیفات و تالیفات:

1 ہمارے افسانے، سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد، 1935
2 فنِ افسانہ نگاری، سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد، 1935
3 انتخاب مومن، (مع مقدمہ و تذکرہ)، حالی پبلشنگ ہاؤس، 1942
4 انشا کی تعلیم، جامعہ مکتبہ دہلی، 1943
5 نیا افسانہ، ساقی بک ڈپو، 1946
6 علامہ راشد الخیری (ترتیب مع مقدمہ)، عصمت کتاب گھر دہلی، 1946
7 باغ و بہار مع مقدمہ، اُردو مرکز لاہور، 1952
8 الف لیلیٰ سرشار (انتخاب مع مقدمہ)، کتاب منزل لاہور، 1952
9 آغا حشر اور اُن کے ڈرامے، اُردو مرکز لاہور، 1954
10 ہماری داستانیں، فروغ اُردو لاہور، 1956
11 اندر سبھا مع شرح، اُردو مرکز لاہور، 1957
12 داستان سے افسانے تک، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، 1959
13 فردوسِ بریں (ترتیب مع مقدمہ)، مجلس ترقی ادب لاہور، 1962
14 کلیات میر بہادر علی حسینی مجلس ترقی ادب لاہور، 1966
15 فن اور فنکار، اُردو مرکز لاہور، 1966
16 اقبال شاعر اور فلسفی، مکتبہ عالیہ لاہور، 1968
17 مقالاتِ منتخبہ اورینٹل کالج میگزین لاہور (1925-1970)، لاہور 1970
18 اُردو کا کلاسیکی ادب ڈرامے، جلد ہشتم، نہم تا سیزدہم مجلس ترقی ادب لاہور، 1970-1976

1۔ حافظ عبداللہ کے ڈرامے، جلد دہم طبع اول، اگست 1971

2۔کریم الدین کے ڈرامے، جلد ہشتم طبع اول، جولائی 1972
3۔متفرق مصنفین کے ڈرامے، جلد یازدہم طبع اول، مئی 1973
4۔طالب بنارسی کے ڈرامے، جلد سیزدہم طبع اول، جون 1975
5۔نامعلوم مصنفین کے ڈرامے، جلد نہم طبع اول، جولائی 1976

19 اقبال معاصرین کی نظر میں، مجلس ترقی ادب لاہور، 1973
20 اقبالیات کا مطالعہ، اقبال اکیڈمی لاہور، 1977
21 بیتال پچیسی (مظہر علی ولا)، لاہور 1987
22 فورٹ ولیم کالج (سید وقار عظیم کی غیر مطبوعہ تحریریں)، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمان، یونیورسل بکس لاہور، 1986
23 اُردو ڈرامہ فن اور منزلیں (مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمان)، یونیورسل بکس لاہور، 1991
24 چند قدیم ڈرامے (تعارف اور تجزیہ)، (مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمان) یونیورسل بکس لاہور، 1991
25 اُردو ڈرامہ تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ (سید وقار عظیم کی تحریریں، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمان)، الوقار پبلی کیشنز لاہور، 1996
26 وقار غالب، (غالب سے متعلق سید وقار عظیم کی تحریریں، مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)، لاہور، 1997
27 مثنوی گلزار نسیم مع مقدمہ۔اُردو مرکز لاہور، س ن
28 مثنوی زہر عشق مع مقدمہ، مکتبہ ادب لطیف لاہور، س ن
29 مرثیے پر چند تحریریں، الوقار پبلی کیشنز لاہور، 2005

کتابچے:

یہ کتابچے محکمہ تعلیم و ترقی کے تحت، سید وقار عظیم نے 1939 سے 1946 کے درمیان مرتب کیے اور انھیں جامعہ ملیہ دہلی نے شائع کیا۔

فسانۂ عجائب، باغ و بہار (حصہ اول، دوم، سوم، چہارم)، داستان امیر حمزہ (حصہ اول، دوم، سوم، چہارم)، حاتم طائی (حصہ اول، دوم، سوم، چہارم)، بیتال پچیسی، رانی کیتکی کی کہانی، مثنوی میر حسن (منثور)، مثنوی گلزار نسیم (منثور)، موہن جوداڑو۔

درسی کتب:

سید وقار عظیم نے درسی کتب لکھنے کا آغاز اپنے دور طالب علمی 1934 کے فوراً بعد شروع کر دیا۔ یہ درسی کتابیں مختلف مدارس کے لیے سرکاری طور پر منظور ہو کر نصاب کا حصہ بنیں۔

جامعہ ملیہ کے قیام 1938 سے 1946 کے دوران واردھا سکیم کے تحت آپ نے درسی کتابوں کی تالیف کے سلسلے میں بیشتر کام سرانجام دیا۔ بچوں کی چہار درویش کی تیاری میں بھی وقار عظیم نے معاونت کی۔ اُسے کتب خانہ علم و ادب دہلی نے 1946 میں شائع کیا۔

1 پاک اُردو ریڈر (پہلی سے آٹھویں جماعت تک کے لیے)، اُردو اکیڈمی سندھ کراچی 1947

2 نئی کتاب (پہلی سے آٹھویں جماعت تک کے لیے)، اُردو مرکز لاہور، 1951

3 پیارا رنگین قاعدہ، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی 1951

4 اچھی کتاب (قاعدے سے پانچویں جماعت تک کے لیے)، اُردو مرکز لاہور 1957

5 گلستانِ ادب (اُردو اعلیٰ اختیاری، برائے جماعت نہم، دہم)، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور، 1973

6 اُردو قواعد و انشاء (برائے جماعت نہم، دہم)، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور، 1975

تراجم:

1 دنیا کی مختصر تاریخ، (Gilmpses of World History) از H.G.Wales انڈین پریس الہ آباد، 1938

2 ہندوستان پانچ ہزار سال پہلے، 1942

3 تلاش ہند، (Discovery of India) از جواہر لال نہرو، حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی 1945

4 ہندوستان کا اتحاد ملی، دہلی 1946

5 الحمرا کی داستانیں، آئینہ ادب لاہور، 1959

6 آزاد تعلیم اور جمہوری نصب العین، طبع اول: آئینہ ادب لاہور، 1959 آزاد تعلیم اور تہذیب نفس، طبع دوم میں یہ کتاب تبدیل شدہ نام سے شائع ہوئی: آئینہ ادب، لاہور، 1963

7 مدرسے کی زندگی میں بچے کی رہنمائی: آئینہ ادب لاہور، 1959

8 بیماری کے جذباتی اور نفسیاتی پہلو: آئینہ ادب لاہور، 1959

9 امریکی ناول اور اس کی روایت: آئینہ ادب لاہور، 1962

10 ایمرسن کے مضامین: آئینہ ادب لاہور، 1963

11 بچوں کو بہتر بولنا سکھایئے: مقبول اکیڈمی لاہور، 1963

12 مطالعے کے بہتر طریقے: مقبول اکیڈمی لاہور، 1963

13 آیئے دوست بن جایئے: آئینہ ادب لاہور، 1963

14 بچے کی جماعتی زندگی: آئینہ ادب لاہور، 1963

15 دوست بنانا اور دوستی نبھانا: آئینہ ادب لاہور, 1963

16 منطقی فکر کی طرف رہنمائی: آئینہ ادب لاہور, 1964

17 لڑکوں اور لڑکیوں کے مسائل لاہور، 1969 طبع دوم: مسائل والدین لاہور، 1988

سید وقار عظیم کے تحقیقی مضامین:

1 محمد بخش مہجور کی نورتن، خاور ڈھاکہ، 1956

2 طرز داغ میں رنگ مومن کی جھلکیاں، نگار لکھنؤ جنوری 1953

3 اُنیسویں صدی کی ایک دلچسپ تصنیف، خاور ڈھاکہ، اپریل 1953

4 اقبال کی نظموں میں رنگ تغزل، اقبال لاہور، اپریل 1953

5 پریم چند کے افسانوں کا پہلا مجموعہ، ساقی کراچی، ستمبر 1953

6 باغ و بہار اور فسانہ عجائب کا تجزیہ، نقوش لاہور، ستمبر 1953

7 اندر سبھا کی غزلیں اور گیت، ماہِ نو کراچی، جون 1955

8 اندر سبھا کا فن، ماہِ نو کراچی، جولائی 1955

9 داستانی دور کی مختصر کہانیاں، ماہِ نو کراچی، اگست 1956

10 داستان امیر حمزہ، اورینٹل کالج میگزین، لاہور 1956

11 گل وصنوبر کا قصہ، سویرا، لاہور 1958

12 شرار محبت، سرور۔۔۔، استقلال لاہور، اگست 1958

13 عورتوں کے ناول، عصمت (جوبلی نمبر) کراچی جولائی اگست 1958

14 اکبر کی غزل، ہم قلم کراچی، جنوری 1961

15 لکھنؤ کا دبستانِ شاعری اور آتش کی غزل، صحیفہ لاہور، جولائی 1963

16 اقبال کی پسندیدہ بحریں، ادب لطیف لاہور، اگست 1964
17 مقدمہ: ''نقلیات'' (گلکرسٹ)، 1966

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، پنجاب یونیورسٹی کے لیے مضامین: (اشاعت: 1992)

18 میر امن دہلوی
19 رجب علی بیگ سرور
20 مومن خان مومن
21 پریم چند
22 اُردو ناول
23 اُردو افسانہ
24 اُردو ڈرامہ
25 داستانیں
26 رباعی

وقار عظیم کے تنقیدی مضامین:

1 شعر انقلاب، سالنامہ ساقی، کراچی، فروری 1950
2 ترقی پسند اکبر: ''نیا دور'' کراچی، اپریل 1950
3 اقبال کی شاعری کا پہلا دور، ''ادب لطیف''، لاہور مئی 1950
4 اقبال کا نظریہ فن: ''ماہِ نو'' کراچی، اپریل 1952
5 مختصر افسانے کے باغی: ''خاور'' ڈھاکا، مئی 1952
6 میراجی کی تنقید، ''ماہِ نو'' کراچی، 1952
7 ہماری داستانیں، ''نقوش'' لاہور، 1952
8 مختصر افسانے میں فن اور زندگی کا امتزاج: ''نقوش لاہور'' اگست 1952
9 کچھ فسانہ عجائب کے بارے میں۔ ''ادبی دنیا''، لاہور جولائی 1952
10 مقدمہ ''سناٹا'' (احمد ندیم قاسمی) نومبر 1952

11 ''سفینۂ غم دل'' پر ایک تنقیدی نظر، ''ہمایوں'' لاہور، نومبر 1952

12 مسدسِ حالی، ''ماہِ نو'' کراچی، دسمبر 1952

13 اکبر کے خطوط، ''ساقی'' کراچی، جنوری/فروری 1953

14 باغ و بہار کے نسوانی کردار، ''نقوش'' لاہور، فروری/مارچ 1953

15 غزل کی ارتقائی صلاحیتیں (مذاکرہ) ''ماہِ نو'' کراچی، فروری 1953

16 آزاد کی غزل، ''خیال'' لاہور، مارچ 1953

17 غزل، ''خیال'' لاہور، اپریل 1953

18 کلامِ اقبال کا ایک کردار، ''ماہِ نو'' کراچی جون، 1953

19 ڈرامہ آغا حشر سے پہلے، ''ماہِ نو'' کراچی، جولائی 1953

20 عظیم بیگ کی مزاح نگاری، ''الحمرا'' لاہور، فروری 1954

21 غالب اور اس کے شارحین، ''الحمرا'' لاہور، اپریل 1954

22 اقبال کے کلام میں لہجے کی اہمیت، ''ہمایوں'' لاہور، اپریل 1954

23 تقسیم کے بعد تین افسانہ نگار، ''ماہِ نو'' کراچی، مئی 1954

24 آغا حشر کا فن، ''ماہِ نو'' کراچی، اگست 1954

25 باغ و بہار اور قبولِ عام، ''نقوش'' لاہور، ستمبر 1954

26 منٹو کے افسانے، ''ساقی'' کراچی، 1954

27 سرور صاحب، ''نقوش'' لاہور، شخصیات نمبر حصہ اول 1955

28 منٹو کا فن، ''نقوش'' لاہور، منٹو نمبر، 1955

29 منٹو، عظیم فنکار، ''ماہِ نو'' کراچی، اپریل 1955

30 بدنام منٹو، ''افکار'' کراچی، اپریل 1955

31 حسرت ـــ شخصیت اور فن، ''علی گڑھ میگزین، اپریل 1955

32 اندر سبھا کی ادبی اہمیت، ''ماہِ نو'' کراچی، مئی 1955

33 مختصر افسانے کے پچیس سال، ''ساقی'' کراچی، جوبلی نمبر، اگست 1955

34 مقدمہ، ''شکستِ خاطر'' (نصرت قریشی) جون 1955

35 رانی کیتکی کی کہانی، ''اردو'' کراچی، جولائی 1956

36 آرائش محفل اور حاتم، ''ادبی دنیا'' لاہور 1956

37 اُردو ناول کا ارتقا، ''سویرا'' لاہور، مارچ 1957

38 سرشار کا ایک کردار، ''روزنامہ امروز'' لاہور، اپریل مئی 1957

39 مقدمہ، ''کشتِ خون'' (امامی بنگلوری) مئی 1957

40 داستان غدر اور بہادر شاہ ظفر، ''روزنامہ امروز''، لاہور 10 مئی 1957

41 بہادر شاہ ظفر، ''آزاد کشمیر'' راولپنڈی، 16 مئی 1957

42 سرشار کی الف لیلیٰ ''ہفت روزہ لیل ونہار'' لاہور 1957

43 قصہ اگر وگل، ''استقلال'' لاہور، اگست 1957

44 کہانی اور آزادی کا حق، ''استقلال'' لاہور، اگست 1957

45 تقسیم کے بعد افسانہ، روزنامہ ''امروز'' لاہور، اگست 1957

46 تقسیم کے بعد ناول ''ہفت روزہ لیل ونہار'' لاہور، 11 اگست 1957

47 بیتال پچیسی، ''ماہِ نو'' کراچی، نومبر 1956

48 آزاد۔ ایک روایت، ''استقلال'' لاہور، جنوری 1958

49 قصہ گو حالی، ''ہمایوں'' لاہور، مارچ 1958

50 شگوفۂ محبت۔ سرور ''لیل ونہار'' لاہور، 19 جنوری 1958

51 ہماری قصہ گوئی کے دس سال، روزنامہ ''امروز'' لاہور، مارچ 1958

52 آزادی کی ایک کہانی، ''بانگ حرم'' پشاور، اگست 1958

53 حقیقت اور افسانہ، ''استقلال'' لاہور، اکتوبر 1958

54 آزادی کی ایک اور کہانی، ''بانگ حرم پشاور، اگست 1958

55 رومان اور افسانہ، ''استقلال'' لاہور دسمبر 1958

56 غزلیں، دوہے، گیت جمیل الدین عالی، ''بانگ حرم پشاور جنوری 1959

57 مجاز۔ ایک آہنگ، ''افکار'' کراچی، جنوری 1959

58 مجالس النساء۔۔۔حالی، ''فروغ اُردو'' لکھنو، مارچ 1959

59 کہانی میں مصنف اور قاری کا رشتہ، ''ماہِ نو'' کراچی، مارچ 1959

60 فسانۂ عجائب کا لکھنوی مزاج، ''افکار'' کراچی (افسانہ نمبر) جنوری 1959

61 حضرت عمر فاروقؓ،''استقلال''لاہور،اپریل 1959
62 بچوں کی کہانیاں،''استقلال''لاہور،مئی 1959
63 چشمہ،اے آر خاتون''ساغر''کراچی،مئی 1959
64 تاریخی ناول اور اس کا فن،''سویرا''لاہور،جولائی 1959
65 ڈرامے کے تماشائی،''استقلال''لاہور،اگست 1959
66 افسانہ کیا ہے؟''استقلال''لاہور،اگست 1959
67 پچھلے سال کے افسانے،''لیل ونہار''لاہور،16 اگست 1959
68 ڈرامہ اور زندگی''امروز''لاہور 25 اکتوبر 1959
69 اُردو کی نثری مطبوعات،''آزاد کشمیر''راولپنڈی،اگست 1959
70 ڈرامے کا فنی تجزیہ،''روزنامہ امروز''لاہور،دسمبر 1959
71 اقبال کی غزل،''ادبی دنیا''لاہور،دسمبر 1959
72 ناصر کاظمی کی غزل۔''اُسلوب''لاہور،دسمبر 1959
73 مقدمہ''اورنگ کی داستانیں''(مترجمہ:الطاف فاطمہ)1959
74 مقدمہ''ریگِ رواں''(غلام علی چودھری)1959
75 مقدمہ''نور ونکہت''(اثر صہبائی)1959
76 اکبر کا گاندھی نامہ،''سالنامہ ادبِ لطیف''لاہور،1960
77 ڈرامے کی ادبی اور فنی قدریں،''ماہِ نو''کراچی،جنوری 1960
78 ادب کی اعلیٰ قدریں،''کامران''سرگودھا،مارچ،اپریل 1960
79 میر ہمارے عہد میں،''نصرت''لاہور(میر نمبر)1960
80 فن اور فنکار،''لیل ونہار''لاہور،مارچ 1960
81 اقبال کی دو نظمیں،''امروز''23 مارچ 1960
82 آزاد کی تنقید کا مزاج،''صحیفہ''لاہور،مئی 1960
83 آزاد۔۔۔تخلیقی ادیب،''اُسلوب''لاہور،مئی 1960
84 افسانے کی فنی ترتیب،''استقلال''لاہور،14 اگست 1960
85 افسانے میں مقامی رنگ،ہفت روزہ''لیل ونہار''لاہور 14 اگست 1960

86 ادب میں مشاہدے کی اہمیت ہفت روزہ ''لیل ونہار'' لاہور 30 اکتوبر 1960

87 مقدمہ ''میکدۂ عشق (درد کاکوروی) فروری 1961

88 قرۃ العین حیدر ایک ناول نگار ''سالنامہ ادبِ لطیف'' لاہور 1961

89 کہانی کا تنقیدی مطالعہ ''استقلال'' لاہور، 11 مارچ 1961

90 علاقائی تہذیب اور قومی زندگی ''نئی قدریں'' حیدرآباد، اپریل 1961

91 اُردو اور علاقائی زبانیں ''قندیل'' لاہور، اپریل 1961

92 ہمارا رسم الخط ''نصرت'' لاہور، جون 1961

93 قومی زندگی میں علاقائی ثقافت کا مقام ''استقلال'' جون 1961

94 اقبال اور آزادیٔ فکر وعمل ''استقلال'' لاہور، جون 1961

95 شبلی کی سیاسی شاعری مشمولہ: مقالاتِ شبلی، (مرتب: ڈاکٹر عبیداللہ خان) ''اُردو مرکز'' لاہور 1961

96 موجودہ دور کے غزل گو ''چٹان'' لاہور، جولائی 1961

97 نئی غزل ''قومی زبان'' کراچی، اگست 1961

98 اثر صہبائی کی نعت گوئی ''اُردو ڈائجسٹ'' لاہور، 1961

99 کہانی اور حسنِ بیان ''لیل ونہار'' لاہور، اکتوبر 1961

100 ہمارا رسم الخط ''ماہِ نو'' کراچی، اکتوبر 1961

101 ظفر علی خان کی قومی شاعری ''استقلال'' لاہور، جنوری 1962

102 جمالیاتی تنقید ''تہذیب الاخلاق'' لاہور جنوری 1962

103 اکبر اور انگریز ''ماہِ نو'' کراچی، مارچ 1962

104 ایک عجیب الخلقت کردار ''امروز'' لاہور 13 مارچ 1962

105 کہانی اور اصلاح معاشرہ ''استقلال'' لاہور، اپریل 1962

106 اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عناصر ''لیل ونہار'' لاہور، 22 اپریل 1962

107 Civil And Military Gazette,27th May 1962, Iqbal _Poet-Thinker.

108 Civil And Military Gazette,27th May 1962,Hasan Nizami.

109 Civil And Military Gazette, July 1962,(اجلے پھول) Ujle Phool (Review).

110 Civil And Military Gazette,August 1962,Sarshar_A Novelist.

111 مولوی عبدالحق کی سیرت نگاری، ''اُردو''(بابائے اُردو نمبر) کراچی، اگست 1962

112 جوش کی غزل، ''افکار''(جوش نمبر) کراچی، ستمبر 1962

113 فسانۂ آزاد کا ہیرو، ''ماہِ نو'' کراچی، اکتوبر 1962

114 اکبر اور انقلاب، ''استقلال'' لاہور، فروری 1963

115 سرشار کی ظرافت، ''ادبِ لطیف'' لاہور، مارچ 1963

116 نیاز فتح پوری کے مختصر ناول، ''نگار''(نیاز نمبر) کراچی، مارچ اپریل 1963

117 اقبال شاعر یا مفکر، ''استقلال'' لاہور، جون 1963

118 کہانی کی منطق، ''فنون'' لاہور، جولائی 1963

119 شخصیت نگار شوکت، ''نقوش''(شوکت تھانوی نمبر) لاہور، اگست 1963

120 اقبال کی نظم ''تسخیرِ کائنات''، ''استقلال'' لاہور، اگست 1963

121 مقدمہ ''ملاقاتیں''(مرتبہ: الطاف حسن قریشی) 1963

122 اقبال بارگاہِ ایزدی میں، ''اقبال ریویو'' کراچی، مارچ 1964

123 گلکرسٹ کی تالیف (کلیات) سالنامہ ''اُردو ڈائجسٹ'' 1964

124 بہترین افسانہ نگار، ''افکار'' کراچی، مئی 1964

125 ہمارے ڈرامہ نگار، ''افکار'' کراچی، جون 1964

126 یک بابی ڈرامے کا فن، ''فنون'' لاہور، جون جولائی 1964

127 مقدمہ ''کلیاں اور کانٹے''(منیر کمال) 1964

128 مقدمہ ''ہر شاخ گل صلیب''(حسن بخت)، جولائی 1964

129 مقدمہ ''حریفِ آدم''(نصیر احمد ناصر) 1965

130 آنسوؤں کا خراج، ''صبحِ نو'' پٹنہ، 1965

131 قصہ چہار درویش اور اس کا مصنف، نومبر 1965

132 شہزادہ جانِ عالم کا قصہ اور اس کا مصنف، اکتوبر 1965

133 جہاد کے سترہ دن، ''روزنامہ مشرق'' لاہور، 23 اکتوبر 1965

134 ایک خطا یاد: مرحوم پرنسپل (میاں محمد عبدالمجید) سالنامہ ''لالہ صحرا''، بہاول نگر، دسمبر 1965

135 اداریہ ''محور'' (جنگ نمبر) پنجاب یونیورسٹی لاہور، 1965

136 نئے دور کی شاعری، ''افکار'' کراچی، فروری 1966

137 شاعری اور شاعری کی تنقید (تبصرہ) ''فنون'' لاہور، فروری مارچ 1966

138 ناول میں جدیدیت کے نقوش، ''مجموعہ''، ''نذر رحمان'' 1966

139 چین میں اُردو، ''محور''، مجلّہ پنجاب یونیورسٹی 1966

140 خودشناسی سب سے بڑی فتح، ''سالنامہ نقوش'' لاہور، 1966

141 انشا میں طنز و مزاح (مشمولہ: ''تنقیدی ادب) 1966

142 مقدمہ ''سرمئی سائے'' (منظر مفتی) 1966

143 خطوں کے آئینے میں، ''سالنامہ اوراق'' جنوری 1967

144 مرزا محمد سعید دہلوی، ''ادبی دنیا''، لاہور، فروری مارچ 1967

145 اُردو مرثیے کا ارتقا، ''نگار'' کراچی، مئی جون 1967

146 مقدمہ، مجموعہ کلام، راز مراد آبادی

147 مقدمہ، مجموعہ کلام، ظفر بریلوی

148 دیباچہ فرہنگ کارواں، ''مکتبہ کارواں''، لاہور

تحقیقی کام کی نگرانی:

پی۔ایچ۔ڈی کے لیے لکھے گئے مقالے جو سید وقار عظیم صاحب کی مدد سے اُن کی رہنمائی یا نگرانی میں لکھے گئے:

1 ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، ''مومن دہلوی'' (1962 میں ڈگری ملی)

2 ڈاکٹر محمد اسلم قریشی ''ڈرامائی نظریے اور تکنیک کی روشنی میں اُردو ڈرامے کا جائزہ۔۔'' (1962 میں ڈگری ملی)

3 ڈاکٹر سید محمود نقوی (سہیل بخاری) ''اُردو کی نثری داستانوں کا تنقیدی مطالعہ'' (1963 میں ڈگری ملی)

4 ڈاکٹر عبیداللہ خان، ''پریم چند ان کا عہد اور فن'' (1963 میں ڈگری ملی)

5 ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی۔ ''نذیر احمد اور اُن کا ادب'' (1967 میں ڈگری ملی)

6 ڈاکٹر ظہیر حسین عابدی: ''مرزا رسوا کی ناول نگاری'' (1967 میں ڈگری ملی)

7 محمد اقبال احمد خاں ''بیسویں صدی میں دبستانِ لکھنؤ کی شاعری'' 1968

8 محمد صابر علی خاں: ''اُردو کے تذکروں کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ'' 1955

9 سید معین الرحمان، ''اُردو ناول۔۔۔رسوا سے پریم چند تک''

10 آمنہ عنایت: ''رتن ناتھ سرشار اور اُن کا ادب''

11 عذرا حیدر، ''اُردو شاعری میں مناظرِ فطرت''

12 ڈاکٹر ناصر احمد خاں (ناصر پرواز ی)، ''اُردو ناول نذیر احمد سے مرزا رسوا تک، 1968

13 ڈاکٹر سلطانہ بخش، ''اُردو کی نثری دستانوں میں طنز و مزاح اور ان کے محرکات کا جائزہ'' 1977

14 ڈاکٹر وزیر آغا، ''اُردو ادب میں طنز و مزاح، 1955

15 ڈاکٹر شمیم ملک: ''آغا حشر کاشمیری۔۔۔حیات اور کارنامے''، 1979

16 ڈاکٹر سہیل احمد خاں: ''اُردو کی نثری داستانوں کا علامتی مطالعہ''، 1979

17 ڈاکٹر رضیہ نور محمد، ''اُردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی جائزہ'' 1976

ایم اے کے لیے لکھے گئے مقالات جو سید وقار عظیم کی مدد، نگرانی یا راہنمائی میں مکمل ہوئے:

1 آفتاب بیگم، فانی بدایونی، 1964

2 آتکہ، اُردو شاعری میں نعت گوئی، 1965

3 اسلم قریشی محمد، فن ڈراما نگاری، 1953

4 اصغر علی شیخ، راشد الخیری، 1950

5 اصغری بیگم، مہاشے سدرشن اور ان کی افسانہ نگاری، 1961

6 بلقیس جمال، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز کے موضوعات کا تنقیدی تجزیہ، 1965

7 امتہ الباری، اُردو کی ناول نگار خواتین، 1961

8 اے بی اشرف، آغا حشر اور اُن کا فن، 1962

9 پروین اختر مرزا، نیاز فتح پوری کا افسانوی ادب، 1966

10 تحریم اختر، محی الدین قادری زور کی ادبی خدمات، 1964

11 تسنیم کوثر، اُردو افسانے میں مزاح نگاری، 1970

12 ثریا ناز، سجاد حیدر یلدرم، 1950

13 حریت ناصر، اقبال کی امیجری، 1967

14 حمیدہ بانو، فسانۂ عجائب کا فنی تجزیہ، 1967

15 حمیدہ فاطمہ، ڈرامے کا مطالعہ (ترجمہ) (پی ملتھیو) 1963

16 حمیدہ ملک، اقبال کی اُردو غزل، 1961

17 حیدر قلی خاں، منیر شکوہ آبادی، 1966

18 خالدہ اکبر، اُردو کی افسانہ نگار خواتین، 1961

19 خالدہ بیگم، اُردو ناول بیسویں صدی میں، 1956

20 خالدہ نسرین، مرزا محمد سعید کی ناول نگاری، 1960

21 خاور قریشی، نذیر احمد کے کردار، 1952

22 خدیجہ، اقبال کی شاعری کا فنی پہلو، 1965

23 خلیق غلام مصطفیٰ، تقسیم کے بعد اُردو افسانہ، 1956

24 خورشید۔ جہاں آرا، نذیر احمد کے ناول، 1956

25 دُرانی مہر افروز، اُردو شاعری پر اقبال کے اثرات، 1956

26 رخسانہ شہزادی، داغ دہلوی، 1967

27 رشید احمد، اختر شیرانی، 1954

28 رشید احمد گوریجہ، اُردو ۔۔۔۔ یک بابی ڈراما، 1964

29 رشیدہ اختر، امراؤ جان ادا کے کردار، 1965

30 رمضان ایوبی، وضاحتی فہرست اورینٹل کالج میگزین، 1965

31 ریاض احمد چوہدری، عزیز احمد، 1964

32 ریحانہ نزہت، شوکت تھانوی کی مزاح نگاری، 1963

33 زاہدہ ملک، عصمت چغتائی، 1967

34 زاہدہ نزہت، سہ ماہی "اقبال" کی وضاحتی فہرست (1952-1959)

35 زریں اختر زیدی، سہ ماہی "اقبال" کی وضاحتی فہرست (1960-1967)

36 زرینہ، اُردو کے مختصر ناول (ناولٹ) 1967

37 زرینہ احمد علی، اقبال اور مناظر فطرت، 1964
38 ستارہ جبیں، جگر مراد آبادی، 1957
39 سجاد حمید خاں، یوٹوپیا (سر ٹامس مور) کا ترجمہ، 1965
40 شائستہ خانم، سید امتیاز علی تاج، 1967
41 شاہدہ روجی، ہاجرہ مسرور، 1967
42 شاہین کوکب، مجاز لکھنوی، 1963
43 شبنم عابد علی، ماڈرن پولیٹیکل تھیوریز، (جوڈ) کا ترجمہ، 1960
44 شکیلہ نور جہاں، بانگ درا کا تنقیدی تجزیہ، 1962
45 شمیم اختر احمد علی، احمد ندیم قاسمی، 1966
46 شمیم ملک، اقبال کی قومی شاعری، 1970
47 شوکت حریم، چکبست لکھنوی، 1962
48 صابر علی خاں لودھی، اُردو مثنوی کا ارتقا، 1955
49 صفورا بشیر، کرشن چندر کی افسانہ نگاری، 1960
50 صفورا سلطانہ، مکاتیب اقبال کا فکری و فنی پہلو، 1961
51 ضیا احمد رضوی، اُردو میں تاریخی ناول، تقسیم کے بعد، 1961
52 ظفر اقبال، اُردو افسانہ اور فسادات، 1964
53 عابدہ کیانی، امیر مینائی اور ان کی شاعری، 1955
54 عاتکہ صدیقی، مولانا صلاح الدین احمد، 1965
55 عارفہ سیدہ زہرا، رجب علی بیگ سرور، 1963
56 عبدالحمید شیخ، پرنسپلز آف لٹریری کریٹی سیزم کا اُردو میں ترجمہ، 1953
57 عبداللطیف اختر، فسانۂ آزاد کے کردار، 1965
58 عُبید اللہ خاں، پریم چند کی افسانہ نگاری، 1953
59 عذرا سلطانہ، اقبال کے سیاسی نظریات، 1965
60 غیور الحسن، جدید مختصر افسانہ، 1950
61 فاروقی سرفراز حسین، کرشن چندر کی افسانہ نگاری، 1962
62 فرحت آرا علی عباس حسینی، 1963

63 فریدہ مفتی، اقبال کا ذہنی ارتقاء، 1961
64 فیروزہ قیصر، پریم چند کے ناول میں عورت کا تصور، 1963
65 کلثوم سلطانہ، پریم چند کے ناول، 1954
66 کنیز راحیہ، سلطان حیدر جوش، 1963
67 کنیز فاطمہ، دیوانِ جرات (ترتیب) 1964
68 کوثر پروین، راجندر سنگھ بیدی، 1961
69 کوکب چغتائی، شاہد احمد دہلوی، 1967
70 مبارک علی مرزا، اقبال کا فلسفہ حیات، 1954
71 مبشرہ سلمٰی، فسادات 1947 اور اُردو ناول 1963
72 مبینہ خانم، اُردو میں رزم نامے و جنگ نامے، 1964
73 محسنہ قریشی، مرزا عظیم بیگ چغتائی، 1957
74 محمد صدیق، اُردو ترجمہ "اقبال لاہوری" (مجتبیٰ مینوی) 1953
75 محمد صدیق جاوید، "بالِ جبریل" کا تنقیدی مطالعہ 1964
76 محمد معظم، ڈاکٹر، ترجمہ "خون اور خون ساز اعضا کے عوارض" 1965
77 مخدومہ زاہدہ قریشی، عزیز لکھنوی 1966
78 مُرید حسین شیخ، ناسخ کے شاگرد اور اُن کی ادبی خدمات، 1954
79 مسرت جبیں مرزا، آلِ احمد سرور بحیثیت نقاد، 1966
80 منزہ صداقت، فسانۂ آزاد کے فروعی کردار، 1969
81 منظور الاسلام، اقبال کے معاشی تصورات، 1971
82 منظور الحق صدیقی، اقبال کے کلام میں حکمرانوں کا تذکرہ، 1953
83 منیر النساء قریشی، اُردو کے مزاحیہ ناول، 1957
84 نازکاظمی، سیدہ، میدانِ عمل کے کردار، 1965
85 ناظمہ تبسم نقوی، قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری، 1966
86 نامی، نیر جہاں، اقبال ـــ قومی شاعر کی حیثیت سے، 1961
87 ناہید طلعت، "اقبال ریویو" (1960 ـــ 1967) کی وضاحتی فہرست، 1967
88 نجمہ چوہدری، اُردو افسانوں میں پنجاب کے دیہات، 1963

89 نذیر خاں عابد، حالی کی سیرت نگاری، 1950

90 نرجس خاتون، تلوک چند محروم، 1963

91 نسرین کوثر، جدید اُردو افسانہ اور نفسیات، 1965

92 نسیم ریحانہ، ظریف لکھنوی، 1964

93 نگہت کوثر، جدید اُردو افسانہ اور نفسیات، 1963

94 ولید میر، راجندر سنگھ بیدی، 1965

95 یاسمین حسین، جدید اُردو افسانے میں پاکستانی زندگی، 1970

96 یاسمین سلطانہ، اقبال کی طویل نظموں کا تجزیہ، 1963

وقار عظیم کے بارے میں لکھے جانے والے تحقیقی مقالات برائے ایم۔اے، ایم۔فل، پی۔ایچ۔ڈی (اُردو):

1 مقالہ نگار ثمرین اختر، سید وقار عظیم بحیثیت اقبال شناس نگران، پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد قریشی، صدر شعبہ اُردو/ ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز، (مقالہ برائے ایم فل، اُردو) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، 2006

2 مقالہ نگار، ماہید اختر، پروفیسر سید وقار عظیم بطور اقبال شناس نگران ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، (مقالہ برائے ایم اے اُردو)، گورنمنٹ کالج فیصل آباد، 1976، 1978

3 مقالہ نگار محمد ارشد خان، سید وقار عظیم کی تنقید نگاری، نگران ڈاکٹر سہیل احمد خان، (مقالہ برائے ایم اے اُردو)، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج لاہور 1982، 1984

4 مقالہ نگار، روشینہ ریاض، پروفیسر وقار عظیم بطور غالب شناس، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن مقالہ برائے ایم اے اُردو)، گورنمنٹ کالج لاہور، 1996

5 مقالہ نگار، صفدر علی ۔سید وقار عظیم ۔اُردو افسانوی نثر کی تنقید نگران، ڈاکٹر مزمل بھٹی صاحبہ، (مقالہ برائے ایم۔اے اُردو) اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور 2011

6 مقالہ نگار، ڈاکٹر اصغر ندیم سید، پروفیسر سید وقار عظیم ۔افسانوی ادب کے نقاد نگران: ڈاکٹر انوار احمد (مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی) بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان 2007

☆☆☆☆

باب سوم:

افسانوی ادب کی تنقید

اُردو فکشن کی تحقیق و تنقید کے حوالے سے جو تین چار نام ذہن میں آتے ہیں۔اُن میں سید وقار عظیم کا نام کئی اعتبار سے خصوصیت رکھتا ہے۔اُنھوں نے داستان، ناول، افسانے اور ڈرامے کے فن پر بھی لکھا مشرقی اور مغربی ماخذات سے استفادہ کر کے اِن کے فنی وسائل اور تکنیکی تنوع پر بھی لکھا۔بہت سے متن بھی مرتب کیے داستانوں، ناولوں اور ڈراموں کے۔جن متون کو انھوں نے مرتب کیا ان کے تعارف ناموں اور مقدموں سے وہ محقق کے طور پر بھی سامنے آئے اور اس حوالے سے دیگر محققین کا انداز ''ہم چو ما دیگرے نیست'' کبھی نہیں اپنایا اور نہ اپنے اخذ کردہ تحقیقی نتائج کے حوالے سے کوئی سنسنی خیزی پیدا کی۔میرے نزدیک یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ اس باب میں چار ذیلی عنوانات قائم کر کے ایسا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے کہ بنیادی طور پر ان کے کام سے تعارف ہو جائے۔

الف: داستانوی تنقید

سید وقار عظیم کی کتابیں ''ہماری داستانیں'' اور ''فورٹ ولیم کالج'' تو براہ راست داستان کی تنقید کا سرمایہ ہیں۔البتہ ''داستان سے افسانے تک'' اور ''فن اور فن کار'' میں بھی اُن کے چند ایسے مضامین شامل ہیں جو اسی ذیل کی تنقید میں آتے ہیں۔اِن کے علاوہ انھوں نے بہادر علی حسینی کی ''نقلیات'' کو بھی مرتب کیا اور اُس کا جو مقدمہ لکھا وہ داستانوی تحقیق اور تنقید کے ساتھ ساتھ لسانیات میں بھی ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔انھوں نے اپنی معروف کتاب ''ہماری داستانیں'' میں داستان کے فن پر بہت عمدگی سے اہم نکات اُٹھائے ہیں اور نہایت دل نشین انداز میں اُنھیں بیان کر دیا ہے:

> ''داستانیں کہنے اور داستانیں لکھنے میں ہمیشہ بڑا گہرا ربط رہا ہے۔ہر زمانے میں لوگوں کو داستانیں سننے اور پڑھنے سے یکساں دل چسپی رہی ہے اور ہر زمانے میں کہی اور لکھی جانے والی داستانوں میں تخیل کی کارفرمائی حد سے زیادہ رہی ہے۔فرق

صرف یہ ہے کہ داستان کہنے اور لکھنے والوں نے مقامی ماحول اور مقامی مذاق سے متاثر ہو کر داستانوں میں داستان کی ساری خصوصیتیں برقرار رکھ کر بھی ان کے مضمون اور انداز میں جزوی تبدیلیاں کی ہیں ۔ان میں سے بعض فرق ارادی ہیں اور بعض غیر ارادی طور پر تحریروں میں داخل ہو گئے ہیں ۔فسانۂ عجائب اِس اثر کی بڑی نمایاں اور واضح مثال ہے ۔اس قصے میں ایک طرف تو سرور کی شخصیت نے داستان کی تشکیل و ترتیب میں نئے نئے نقش بنائے ہیں اور دوسری طرف لکھنوی معاشرت اور مذاق کے مخصوص انداز نے قصے کی تفصیلات میں امتیازی رنگ پیدا کیے ہیں ۔یہی صورت ذرا کمتر انداز میں باغ و بہار، آرائشِ محفل اور بوستانِ خیال میں بھی موجود ہے ۔''(ہماری داستانیں ،صفحہ 18)

''داستانوں پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی تعمیر و تشکیل سرے سے غیر فطری عناصر سے ہوئی ہے ......جن ،دیو، پریاں ،جادوگر ،سحر ،اسم اعظم ،اسم تسخیر ،لوحِ نقش، قلب ماہیت، ......اور ان سب کے ساتھ ایسے مرد جو طاقت، جوانمردی، جرأت، ہمت، جود و سخا، محبت ،ایثار ،ہر چیز میں عدیم المثال ہیں اور ایسی عورتیں جن کے حسن و محبوبی کی دونوں جہانوں میں نظیر نہیں ۔یا ایسے انسان جو بدی کا مجسمہ ہیں اور ساری بدیاں ان میں بیک وقت جمع ہیں ۔ایک بڑی سے بڑی مہم کو سر کرتا ہے ،ہفت خواں طے کرتا ہے اور اپنی مرادِ عشق کو پہنچتا ہے اور دوسرا اپنی ساری غیر معمولی قوتوں کے باوجود پہلے سے متصادم ہوتا ہے تو روسیاہی نصیب ہوتی ہے ۔''(ہماری داستانیں ،صفحہ 24)

''یہ داستان شب کی تنہائی میں چھپ کر پڑھی جاتی تھی اور عاشق مہجور کے لیے تسکین اضطراب کا سبب بنتی تھی اور بزمِ احباب میں سنائی جاتی تھی ......بے خودی کی یہ دولتِ بے پناہ اس دنیا کا مقصود ہے جسے داستانوں نے اپنایا ہے یہاں کے حقائق ہماری آپ کی دنیا کے حقائق سے بالکل مختلف ہیں ۔اس میں جن ،دیو اور پریاں آباد ہیں ۔''
(ہماری داستانیں ،صفحہ 10، 11)

سید وقار عظیم نے ''ہماری داستانیں'' میں داستانوں کے فنی خصائص اجاگر کیے ہیں اور پھر باغ و بہار، رانی کیتکی کی کہانی ، داستانِ امیر حمزہ ،آرائشِ محفل ، بیتال پچیسی ،نورتن ،فسانۂ عجائب ،شرارِ عشق،

شگوفۂ محبت، گل وصنوبر، قصہ اگر وگل اور سرشار کی الف الیلیٰ کے بارے میں ایسے مضامین لکھے ہیں جو بلا شبہ داستانوی تنقید میں آج بھی یادگار حیثیت رکھتے ہیں۔ چند اقتباسات دیکھیے:

''باغ و بہار کے کرداروں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ جب پہلی بار ہمارے سامنے آتے ہیں تو اپنی صورت، سیرت اور کردار کی ایک جھلک دکھا جاتے ہیں جو بننے والی تصویر کے خاکے کا کام دیتی ہے۔ اس خاکے میں رنگ آنے والے واقعات خود بخود بھرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ کہانی ختم ہوتی ہے تو تصویر کا ہر رنگ واضح اور اُبھرا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ بات مرد کرداروں میں کم اور نسوانی کرداروں میں زیادہ ہے اور ان نسوانی کرداروں میں بھی زیادہ سے زیادہ پہلی داستان کی ہیروئن میں ہے۔ اس کی تشکیل اور تعمیر میں داستان گو نے اپنے فن کی پوری قوت صرف کی ہے۔ اس کے کسی نقش کو نہ ادھورا چھوڑا ہے نہ اس کی مصوری میں کہیں غیر ضروری شعریت کو دخل دیا ہے۔ وہ سہل انگاری جو بہت سی کہانیوں کے کرداروں کو برزخ میں لاکر چھوڑ دیتی ہے، یہاں نظر نہیں آتی ......اب اس اجمال کی تفصیل سنیے:

اس بیان سے کہ ''میری طرف دھیان نہ دیا'' عشق کی حسرت تو یقیناً ٹپکتی ہے لیکن دوپٹے کا آنچل منہ پر لے لینے اور دیکھنے والے کی طرف دھیان نہ دینے میں ایک شان بے نیازی بھی ہے...... بے نیازی کی یہ شان جو محض بے نیازی کی حد سے گزر کر تکبر، تمکنت اور شدید احساسِ برتری کی صورت میں ظاہر ہوتی رہتی ہے، ہیروئن کی شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے (اس حسن سے قطع نظر جس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے) اور اس کی غمازی نہ صرف منہ سے نکلی ہوئی باتوں سے ہوتی ہے بلکہ چشم و ابرو کی ہر جنبش بھی اس کی ''شاہد عادل'' ہے۔'' (ہماری داستانیں، صفحہ 91، 92)

قافیے کے التزام نے عبارت کو کسی قدر پُر تصنع بنا دیا ہے لیکن عبارت کا یہ تصنع شکر ہے کہ رانی کیتکی کی کہانی میں بہت کم جگہ ہے۔ انشا کو زبان پر جو قدرت حاصل ہے اور ان کے ذہن کے خزانے میں الفاظ کا جو بیش بہا اور خاصا بڑا سرمایہ ہے اس نے انشا کے لیے مشکل سے مشکل بات کو آسان بنایا ہے۔ اس قادرالکلامی کا ایک پہلو، جسے انشا کی ذہانت نے اور جلا دی ہے یہ ہے کہ ان کی عبارت میں ہمیں کہیں کہیں

ایسے لفظ بھی ملتے ہیں جو فرسودہ ہونے کے باوجود اس قابل ہیں کہ اُنھیں اپنایا اور سینے سے لگایا جائے۔'' (ہماری داستانیں، صفحہ 136)

''اشک کے نسخے کی عبارت کے مقابلے میں جب لکھنوی نسخے کی عبارت کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لکھنوی مولفین نے اپنی کتاب میں بہت سے موقعوں پر ربط و آہنگ پیدا کرنے، موزوں فضا قائم کرنے اور عبارت کو ادبی اور شاعرانہ بنانے کی غرض سے اتنے اضافے کیے ہیں کہ یہ نسخہ بجائے خود ایک الگ تصنیف و تالیف معلوم ہونے لگتا ہے، ایسے موقعوں پر اصل اور نقل (یا نظر ثانی) میں اتنا فرق پیدا ہو گیا ہے کہ دونوں میں کسی طرح کی مطابقت اور یک رنگی تلاش کرنے میں بھی دشواری ہوتی ہے۔ اِسی طرح کے اضافوں نے اس نسخے کی ضخامت اصل سے ڈیڑھ گنی کر دی ہے۔'' (ہماری داستانیں، صفحہ 200)

''بیتال پچیسی'' اپنے عام اُسلوب کے اعتبار سے اُس زبان سے قریب ہے جسے ہم اصطلاح میں ''ہندوستانی'' کہتے ہیں اور اُس میں فارسی اور عربی کے مانوس لفظوں کی جگہ ہندی کے مانوس و غیر مانوس الفاظ کی کثرت ہے۔ اس زبان کا انداز کیا ہے اس کے اندازے کے لیے ''بیتال پچیسی'' کی مختلف کہانیوں کے جملے دیکھیے:

''مہنڈاری راجا کی آ گیا پر تت سب پھل لے آیا؟ ...... اور یہ راجا کا پُتر نہایت نراس ہوا بر ہ میں ڈوبا ہوا دیوان کے لڑکے کے پاس آیا ...... بڑھیا نے کہا: ''جس کنور کا تو نے من لیا تھا سو میرے گھر آن کر اُترا ہے۔ اس نے تجھے یہ سندیسہ دیا ہے کہ جو وچن کیا تھا وہ پورا کرو۔'' (ہماری داستانیں، صفحہ 281)

''میر امن کی اس چھوٹی سی بات کو پکڑ کے اور اس پر خوا مخواہ دو چار فقرے چست کر کے سرور نے اپنے آپ کو ان تیکھے اور بگڑے دل انسانوں کی صف میں کھڑا کیا ہے جو اپنی آن بان پر مرتے اور ہوا سے لڑتے ہیں۔ سرور سے درباری زندگی کی سازشوں نے وطن چھڑا کر غریب الوطنی کے عذاب میں مبتلا کیا۔ اُن کا بس دھوبی پر نہ چلا تو گدھے کے کان اینٹھے۔ بادشاہ کو تو کچھ کہہ نہ سکے دل کا سارا بخار بے چارے میر امن پر اُتارا اور ایک سیدھی سی بات کو مناقشہ کا رنگ دے دیا۔'' (ہماری داستانیں، صفحہ 357)

اس حصے کے آغاز میں بہادر علی حسینی کی ''نقلیات'' میں سید وقار عظیم کے مقدمے کا ذکر کیا گیا ہے۔جس کے دو اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔جو سید وقار عظیم کے اُس انہماکِ علمی کو ظاہر کرتے ہیں جو اُنھیں اُردو داستان کی روایت اور زبان وبیان کے ساتھ تھا:

''مقدمے کے کسی حصے میں مَیں نے گل کرسٹ کے اس بیان کا حوالہ دیا ہے کہ ان نقلوں کی تصنیف وتالیف میں میر بہادر علی حسینی نے دوسرے منشیوں سے بھی مدد لی ہے۔میں نے فورٹ ولیم کالج کی چھپی ہوئی ان سب کتابوں کو،جن میں کسی نہ کسی طرح نقلیں اور حکایتیں وغیرہ بیان کی گئی ہیں،اس نظر سے دیکھا کہ شاید ان میں سے کسی میں کوئی نقل ایسی مل جائے جو''نقلیات''میں شامل ہو،لیکن اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی۔البتہ ایک چیز ایسی سامنے آئی جس سے گل کرسٹ کے بیان کی تائید ہوئی۔ڈاکٹر عبادت بریلوی کو اپنے لندن کے قیام میں حیدر بخش حیدری کی بہت سی مختصر حکایتیں ملی ہیں۔ان میں سے چند انھوں نے''افکار'' کراچی کے افسانہ نمبر 19 64 میں چھپنے کے لیے بھیجی ہیں۔ان حکایتوں میں سے دو ایسی ہیں جو ''نقلیات''میں بھی شامل ہیں۔''(نقلیات،صفحہ 31)

''نقلیات کی ترتیب میں قدم قدم پر اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ ہر نقل مبتدی غیر ملکیوں کو بعض نئے لفظوں اور محاورں اور نئی کہاوتوں سے روشناس کرانے کے علاوہ انھیں ان کے استعمال پر قادر بنائیں اور وہ باتوں باتوں میں یہ دلچسپ حکایتیں پڑھتے پڑھتے آہستہ آہستہ اپنے آپ کو اس معاشرتی اور تہذیبی ماحول اور فضا سے قریب ہوتے اور اس کا ایک حصہ بنتے اور کبھی کبھی اس میں گم ہوتے محسوس کرسکیں اور پھر رفتہ رفتہ انھیں ان نقلوں،حکایتوں،چٹکلوں اور لطیفوں میں ان لوگوں کے ذہن اور قلب کا عکس نظر آسکے،جن کی زندگی اُن کا منبع اور اُن کا گہوارہ ہے،یہی وجہ ہے کہ ان نقلوں کی زبان کو عموماً اس ٹکسالی روزمرہ اور اس محاورے سے قریب رکھا گیا۔''(نقلیات،صفحہ 29)

فورٹ ولیم کالج کئی اعتبار سے تاریخِ ادبِ اُردو کا ایک اہم باب ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں دو بڑی قوموں اور ان کی زبانوں کی وجہ نزاع کو سمجھنے میں بھی مددگار رہتا ہے۔اس موضوع پر اُردو میں سید محمد کی ایک مختصر کتاب ''اربابِ نثر اُردو''اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔جسے کم وبیش پورے کا پورا

حامد حسن قادری نے ''داستانِ تاریخ زبان اُردو'' میں نقل کر دیا تاہم عتیق صدیقی کی کتاب ''گلکرسٹ اور اُس کا عہد'' نے مباحث کے نئے در کھولے اور پھر مجلسِ ترقیِ ادب لاہور نے فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات کو اہلِ علم سے مرتب کرا کے شائع کرنا شروع کیا۔اس حوالے سے تحقیق کے طلب گاروں کے لیے یہ ضروری تھا کہ سید وقار عظیم فورٹ ولیم کالج پر الگ سے کوئی کتاب لکھتے۔خاص طور پر اس لیے بھی کہ فورٹ ولیم کالج سے شائع ہونے والی بیشتر کتابوں پر وہ ''داستان سے افسانے تک'' ''ہماری داستانیں'' اور اپنے ایک تنقیدی مجموعے ''فن اور فنکار'' میں مضامین لکھ چکے تھے۔یہ کتاب ''فورٹ ولیم کالج تحریک اور تاریخ'' (الوقار پبلی کیشنز، 1995) اُن کی وفات کے بعد شائع ہوئی جو ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے مرتب کی جنھوں نے اس کے دیباچے میں لکھا:

''فورٹ ولیم کالج کے بارے میں وقار عظیم صاحب کی یہ کتاب خود ان کے قلم سے لکھی ہوئی میرے ذاتی ذخیرہ نوادر میں محفوظ ہے۔کاغذ کے صرف ایک طرف لکھا گیا ہے۔مسودہ کل 109 اوراق پر مشتمل ہے۔ہر ورق کے 61/2 انچ ضرب نو انچ سائز پر بالعموم 24,23 سطریں آتی ہیں۔کتاب کا یہ قلمی مسودہ وقار عظیم صاحب نے اپنے کاغذوں اور کتابوں وغیرہ کی چھٹائی کے بعد اپنے بعض دیگر متفرق مسودات، یادداشتوں اور تراشوں اور اپنے نام موسومہ بہت سے مکتوبات وغیرہ کے ساتھ، 1973 میں مجھے مرحمت کیا۔مسودے پر ایسا کوئی اندراج نہیں جس سے حتمی طور پر اس کا زمانۂ تالیف متعین کیا جا سکے۔بعض داخلی شہادتوں سے اس ضمن میں ضرور کچھ مدد ملتی ہے۔...... میں قیاس کرتا ہوں کہ یہ مسودہ 1953 سے 1957 کے لگ بھگ کبھی صورت پذیر ہوا۔'' (فورٹ ولیم کالج، صفحہ 13، 14)

وقار عظیم صاحب کی فورٹ ولیم کالج پر تحریر جیسا کہ مرتب نے اوپر بیان کیا ہے 1953 سے 1957 تک کے زمانے میں لکھی گئی اس کے بعد کئی محققوں نے اس حوالے سے تحقیق کی اور بہت سی نئی باتیں سامنے آئیں۔مرتب نے جہاں جہاں ضرورت محسوس کی اس حوالے سے نئی معلومات فراہم کر دی ہیں جس سے کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔چند مثالیں یہ ہیں:

''حیدری کی ''گلِ مغفرت'' کے بارے میں سید وقار عظیم نے لکھا ''گلِ مغفرت'' حیدری کی آخری تالیف ہے۔1812 میں لکھی گئی اور اسی سال کلکتہ سے شائع ہوئی۔

''گلِ مغفرت'' بھی حیدری کی دوسری کتابوں کی طرح اب کہیں نہیں ملتی۔''(فورٹ ولیم کالج، صفحہ 66)

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اضافہ کیا:

''گلِ مغفرت''(حیدری) ڈاکٹر ناظر حسن زیدی کے مقدمے کے ساتھ مجلس ترقی ادب لاہور کی جانب سے جنوری 1965 میں چھپ چکی ہے۔''(فورٹ ولیم کالج، صفحہ 66)

اور اس سے ایک صفحہ پہلے''کربل کتھا''(فضل علی فضلی) کے بارے میں بھی مرتب ہی بتاتے ہیں کہ''یہ کتاب مدت سے نایاب خیال کی جاتی تھی اب یہ شائع ہو چکی ہے دیکھیے:

1۔ کربل کتھا، مرتبہ: مالک رام اور ڈاکٹر مختارالدین احمد، ادارہ تحقیقات اُردو، پٹنہ، اکتوبر 1965

2۔ کربل کتھا، مقدمہ: ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، دہلی یونیورسٹی، دہلی، مارچ 1961

3۔ کربل کتھا، مقدمہ: ڈاکٹر احسن الحق، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1982

(فورٹ ولیم کالج، صفحہ 65)

4۔ اسی طرح جہاں خلیل علی خاں اشک کے بارے میں سید وقار عظیم صاحب نے لکھا:

''فورٹ ولیم کالج کے اربابِ قلم میں صرف اشک ایسے ہیں جن کے نام اور تخلص کے سوا اُن کا ذرا سا حال بھی کہیں نہیں ملتا۔''(فورٹ ولیم کالج، صفحہ 129)

وہیں مرتب نے حاشیے میں وضاحت کی ہے کہ نئی تحقیق کے مطابق اشک نے انتخاب سلطانیہ کے دیباچے میں اپنے سوانحی حالات درج کیے ہیں۔ جنھیں اپنے مقالے فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات میں ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے درج کیا ہے:

''سیّد وقار عظیم نے اردو افسانوں اور داستانوں کو تنقید کے لیے منتخب کیا اور اس سلسلے میں تخصص کا درجہ حاصل کیا۔ بعد میں دوسرے نقادوں نے بھی اس طرف توجہ کی مگر اولیت کا سہرا ابھی وقار عظیم کے سر رہا اور اپنے دور میں قدیم اور معاصر افسانوی ادب پر حرفِ آخر کا اعزاز بھی انھی کے حصے میں آیا۔''(احمد ندیم قاسمی، پدرم سلطان بود، صفحہ 138)

''افسانہ، داستان اور فکشن پر اُردو میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں وقار صاحب کی تحریریں سب سے ممتاز و منفرد ہیں۔''(ڈاکٹر جمیل جالبی، پدرم سلطان بود، صفحہ 94)

ب) ناول کی تنقید:

سید وقار عظیم نے داستان اور افسانے پر جس قدر لکھا اُتنا ناول یا ڈرامہ پر نہیں ۔لیکن ان دونوں اصناف کو بالکل نظر انداز بھی نہیں کیا یہ اور بات کہ زیادہ تر انھی ناولوں پر لکھا جو نصاب میں شامل تھے جیسے عبدالحلیم شرر کا فردوسِ بریں ،رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاداور مرزاہادی کا امراؤ جان ادا.....فردوسِ بریں کے ایک کردار شیخ علی وجودی پر تو پورا ایک مضمون لکھا جواُن کی کتاب ''داستان سے افسانے تک''میں شامل ہے وہ لکھتے ہیں:

''شیخ علی وجودی،میر داستان نہیں بلکہ.....اپنے سارے زہد،اتقا،علم ودانش اور روحانی کمال کے اڈعا کے باوجود اس کی جگہ قصہ میں ''ولن'' کی ہے ۔شیخ علی وجودی ایسا ولن ہے جو قصے میں منظر عام پر آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد قاری پر اپنی یہ حیثیت واضح کر دیتا ہے لیکن جس کی یہ حیثیت ہیرو پر قصہ ختم ہونے سے تھوڑی ہی دیر پہلے کھلتی ہے، اس لیے کہ وہ ہیرو کے نصب العین کے راستے میں حائل ہونے کی بجائے اسے منزل مقصود تک پہنچنے میں مدد دیتا رہتا ہے ۔شیخ علی وجودی کو قصے کی اس صورتِ حال نے عجیب طرح کا ولن بنا دیا ہے کہ اس کے اور ہیرو کے نصب العین میں کوئی واضح تصادم نہیں ۔ہیرو سے جو کام ولن لینا چاہتا ہے اس کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہیرو کے دل میں برابر یہ یقین پختہ تر ہوتا رہے کہ جس حد تک وہ ولن کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن رہے گا۔اسی حد تک اس کی اپنی منزل مقصود اس سے قریب تر ہوتی جائے گی ۔چناں چہ قصے میں ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ جہاں ہیرو اور ولن حسین اور علی وجودی،ایک ہی رخ سفر کرتے ہوئے اور ایک ہی منزل کی طرف نگراں دکھائی دیتے ہیں،جہاں حسین محض رہرو،مقتدی اور مرید ہے اور علی وجودی رہبر،امام اور مرشد۔ناول میں شروع سے آخر تک سوائے خاتمے کے چند لمحوں کے علی وجودی، حسین پر اس طرح چھایا رہتا ہے کہ وہ ہیرو ہوتے ہوئے بھی اس دیو کے سامنے بونا اور اس قوی پیکر بوڑھے کے سامنے ایک مخنی اور بے جان بچہ نظر آتا ہے ۔

علی وجودی کو اتنا زبردست ولن بننے میں اس کے مزاج کی کئی خصوصیتوں نے مدد دی ہے ۔یہ ساری خصوصیتیں علی وجودی میں اس وقت تک پیدا ہو چکی ہیں جب وہ قصے

میں پہلی مرتبہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ماحول،ضرورت اور مصلحت نے مل جل کر اس
کی شخصیت کے نقوش کو اس درجہ پختہ کر دیا ہے کہ اب بظاہر ماحول بھی اس کے آگے
بے بس سا معلوم ہوتا ہے۔ماحول اس بت کو توڑ پھوڑ کر اسے تراش خراش کر اس کے خد
وخال کو ایسی صورت دے چکا ہے کہ زمانے کے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں
کہ اس بت کو اپنا خدا سمجھے۔جب تک علی وجودی کی شخصیت نے یہ مکمل شکل اختیار نہیں
کی تھی وہ زمانے کے ہاتھ کا کھلونا معلوم ہوتا تھا۔وہ اب زمانے اور ماحول کا محتاج
نہیں۔اب اس میں زمانے کو اپنے مقاصد کے سانچے میں ڈھال لینے کی صلاحیت پیدا
ہو چکی ہے۔زمانہ اور وہ زندگی کے سفر میں ہمرکاب و ہم عنان ہیں۔لیکن اس پختہ اور
سانچے میں ڈھلی ہوئی مکمل شخصیت کے آگے زمانے کی حیثیت اس سفر میں فروتر رفیق
کی ہے۔زمانہ کو یہ چابک دست مسافر اپنے اشارے پر جدھر لے جائے،اس کے کہے
پر چلتے رہنے کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے؟''(داستان سے افسانے تک،صفحہ 135)

وقار صاحب کو اس بات کا احساس تھا کہ عصمت چغتائی اور عزیز احمد کا نام اُن کی جراتِ اظہار کے باعث بعض حلقوں میں سنسنی خیزی کا موجب بنا تھا۔اس حد تک کہ ترقی پسند مصنفین کو ایک کانفرنس میں منٹو کے ساتھ ساتھ ان دونوں کے نام بھی اپنے رجسٹروں سے خارج کرنے پڑے تھے۔اس لیے سید صاحب اس دونوں ناول نگاروں کی نمائندہ تخلیقات پر کچھ لکھنے سے پہلے اپنی وضع دار طبیعت کے باعث ایک تمہید باندھتے ہیں:

''ہمارے اچھے ناول نگاروں نے بھی اکثر یہی سوچا ہے کہ فن ایک ہلکی پھلکی سی چیز
ہے۔اس کے لیے محنت مشقت ضروری نہیں۔یہ خونِ جگر کا طالب بھی نہیں اور یہ ایسی چیز
بھی نہیں جسے اپنا بنا کر فنکار اپنے آپ کو زندہ جاوید بنا لیتا ہے۔ہمارے اچھے ناول نگار بھی
اپنے ناولوں میں جا بجا جن سیاسی عقیدوں اور نفسیاتی اور جنسی حقیقتوں کے چھینٹے دیتے
ہیں۔اُن سے اکثر یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ان کے فکر اور محسوسات میں رچا بسا ہوا
نہیں ہے۔جو کچھ کہا جا رہا ہے اسے کہنے والے نے اپنی ذات اور شخصیت کی آنچ دے کر
پختہ نہیں کیا اور اس لیے یہ صدا اکثر کھوکھلی سی معلوم ہوتی ہے۔کبھی کبھی تکدر بھی پیدا کرتی
ہے۔اس کے باوجود یہ گنتی کے چند ناول ان گنت،بے حد گھٹیا،نسبتاً بہتر یا غنیمت ناولوں

کے جھرمٹ میں نمایاں طور پر چمکتے ہیں۔ان میں زندگی کی سچائی بھی ہے اور فن کا خلوص بھی ۔ان سب میں کچھ باتیں ایسی ہیں کہ بے اختیار انھیں سراہنے کو جی چاہتا ہے۔لیکن ایسا شاید کوئی بھی نہیں جسے بار بار بے اختیار پڑھنے کے لیے جی تڑپے ناول کی بلند ترین منزل یہی ہے اور ابھی ہمارے ناول بے حد قابل تعریف ہونے کے باوجود اس منزل سے دور ہیں۔''(داستان سے افسانے تک،صفحہ 162)

پھر وہ اپنی اس تمہید کے تاثر کو زائل کرنے کے لیے عصمت کے نفسیاتی شعور اور فنی اوصاف کی تحسین بجا طور پر کرتے ہیں:

''عصمت چغتائی نے اپنے ناول کی بنیاد اسی نفسیاتی حقیقت پر رکھی ہے اور اس کے علاوہ تحت الشعور کے عمل کو انسانی زندگی اور اس کے افعال سے جو گہرا تعلق ہے۔مختلف قسم کے ماحول سے انسانی ذہن میں جو نفسیاتی گتھیاں پڑ کر اس کے قدم قدم پر اثر انداز ہوتی ہیں۔عصمت نے اپنے ناول میں برابر ان نفسیاتی نکات کو ذہن میں رکھا ہے۔ہماری زندگی میں سیاست،اقتصادیات،فکر اور تخیل جس طرح گھلے ملے ہیں،عصمت کی نظر ان سب پر ہے۔لیکن اس سے بھی زیادہ ان کی نظر اس فطرت پر ہے جو اپنے اظہار کے لیے سماجی قوانین کے جواز کی پابند نہیں۔عصمت کا یہ ناول بھی پریم چند،سجاد ظہیر،کرشن چندر اور عزیز احمد کی طرح آگے بڑھتی ہوئی زندگی اور نت نئی راہیں اختیار کرتے ہوئے فن کا ہم عنان ہے۔یہاں بھی صرف اسی زندگی کو اپنا موضوع بنایا گیا ہے۔جس کے رگ وپے میں لکھنے والے کا ذہن اپنی جگہ بنا چکا ہے۔اسی زندگی کو غور وفکر نے نئے فن کے سانچے میں ڈھالا ہے اور اس طرح امراؤ جان ادا سے ٹیڑھی لکیر تک ہمارے ناول نے بہت کچھ کھویا ہے۔لیکن اس نے کچھ پایا بھی ہے۔گنتی کے چند ناولوں کے سوا باقی سب ناول نہ زندگی کے ہم عنان ہیں نہ فن کے۔وہ ایک کے نام پر دھبہ ہیں اور دوسرے کی نزاکت پر بار۔انھوں نے زندگی میں پست قدروں کا ساتھ دیا ہے اور فن میں سستے اور کھوکھلے معیار کی تبلیغ کی ہے۔انھوں نے ادب کو آگے بڑھنے سے روکا ہے اس کی راہ میں روڑے اٹکائے ہیں۔''(داستان سے افسانے تک،صفحہ 160)

اب اس اقتباس میں دیکھیے، ناول نگاری اوراس کےفن کے حوالے سے وقار عظیم صاحب کے خیالات کیا ہیں:

''ناولوں میں دل چسپی اور فن کے لطیف عناصر کو یکجا کرنے کا جذبہ ہمارے فن کاروں میں کتنی شدت کے ساتھ موجود ہے اس کا مظاہرہ موجودہ دور کی ناول نگاری کے بعض اور رجحانات سے بھی ہوتا ہے۔ یہ رجحانات ایک طرف معروف ناول نگار خان محبوب طرزی کے ان ناولوں میں نظر آتے ہیں جن میں انھوں نے سائنس کی مختلف ایجادات اور انکشافات کو فرد اور معاشرے کی زندگی پر اثر انداز ہوتے دکھایا ہےاور ماحول کی ایک ایسی حقیقت کو جس کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں دی گئی ناول کے فن میں بڑی خوش اُسلوبی سے سمویا ہےاوراس طرح علم، فن اور سائنس کے امتزاج سے دلچسپ ناول کی تخلیق کی ہے فن کے احساس اور دل چسپی و تاثیر کو یکجا کر کے دیکھنے کی خواہش بعض اچھے جاسوسی ناولوں کی تخلیق کا باعث بنی ہے ۔حال ہی میں ایک ناشر نے کچھ انگریزی جاسوسی ناولوں کے ترجمے بڑے ستھرے علمی انداز میں چھاپے ہیں اور اس سے بھی زیادہ اہتمام سے معروف انگریزی ناولوں کے ترجمے شائع کیے ہیں ۔تقسیم کے بعد دس برسوں میں اُردو میں ترجنیف، موپساں، ڈی۔ایچ لارنس، فلابیر، بالزاک ہل ویل، ہنری جیمس، دوستو وسکی، سومرسٹ ماہم جیسے فن کاروں کے ناول اُردو میں منتقل ہوئے ہیں اور حسن عسکری، قرۃ العین حیدر، شفیق الرحمٰن، حجاب امتیاز، انتظار حسین اور انور عظیم جیسے افسانہ نگاروں نے ان کے ترجمے کیے ہیں ۔اچھے لکھنے والوں کا ان ترجموں کی طرف مائل ہونا اور ان کا پورے حسن واہتمام سے شائع ہونا اس بات کی شہادت ہے کہ ہمارے قاری، ناشر اور مصنف، ناول کو اسی علمی اور فنی سطح پر لانے کے خواہش مند ہیں جس کا حقیقت میں یہ مستحق ہے۔

تقسیم کے بعد اُردو میں جتنے ناول لکھے اور چھاپے گئے ہیں انھیں دیکھ کر آسانی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ناول ہمارے ادب کے موجودہ دور کی سب سے مقبول صنف ہے۔گو اس سب سے مقبول صنف کو بہت کم لکھنے والوں نے اس سنجیدگی اور انہماک کا مستحق جانا جس کے بغیر ادبی وفنی تخلیقات عظیم نہیں بنتیں لیکن اس کثرت اور بے توجہی میں بھی

جا بجا ایسے جواہر ریزے چمک جاتے ہیں کہ ناول کو اُردو میں بھی مستقبل کی صنف کہے بغیر چارہ نہیں۔" (داستان سے افسانے تک، صفحہ 174)

جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا وقار عظیم صاحب نے افسانے، داستانوں اور ڈرامے کی نسبت ناول پر کم لکھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ اِس صنف کو کچھ اور وقت دے دیتے تو اُردو ناول کی تنقید اس قدر پسماندہ نہ ہوتی۔

ج) افسانوی تنقید:

سید وقار عظیم نے اُردو افسانے کے حوالے سے بطورِ خاص تین کتابیں لکھیں:

1 فنِ افسانہ نگاری (اُردو مرکز لاہور، 1961، دوسرا ایڈیشن)

2 ہمارے افسانے (اُردو مرکز لاہور، ستمبر 1950، دوسرا ایڈیشن)

3 نیا افسانہ (ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1977)

اس کے علاوہ "داستان سے افسانے تک" اور "فن اور فنکار" میں بھی ایسے مضامین شامل ہیں جو افسانے کے فن اور روایت کے حوالے سے اہم نکات کو سامنے لاتے ہیں۔ ان کے علاوہ سید وقار عظیم کی ایک مختصر کتاب اعجاز پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے 1982 میں "منٹو کا فن" کے نام سے شائع ہوئی۔ جو حقیقت میں اس عنوان کے اُن کے ایک مضمون پر مشتمل ہے۔ جو من و عن "داستان سے افسانے تک" میں شامل ہے۔

بظاہر ایسا دکھائی دیتا تھا کہ سید وقار عظیم اپنی کتاب "ہماری داستانیں" میں جو کچھ داستان طرازی کے بارے میں لکھ چکے ہیں، اس میں معنوی اضافہ ممکن نہیں مگر 1966 میں ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "فن اور فن کار" شائع ہوا تو احساس ہوا کہ تنقید اور تحقیق میں اضافے کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے، انھوں نے "کہانی کی منطق" کے عنوان سے جو مضمون لکھا، وہ داستانوں اور افسانوی تنقید میں ان کی وسعتِ مطالعہ کے ساتھ اس صنفِ ادب کے مزاج کو بھانپنے کی ان کی صلاحیت کو ظاہر کرتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"کسی نے کہانی کی تعریف یہ کہہ کر کی ہے کہ "کہانی ایک حل طلب معمہ ہے۔"

اور یہ بات سچ ہے اور معتبر سے معتبر منطق بھی اس کو سچ تسلیم کرے گی کہ کہانی میں اگر معمہ کی کیفیت نہ ہو تو پڑھنے والے یا سننے والے کے لیے اس میں ذرا بھی کشش نہیں۔ کہانی کا معمہ ہونا ہی

اسے دلچسپ بناتا ہے۔ کہانی ایک اہم اور بعض صورتوں میں پیچیدہ سوالیہ نشان ہے۔ کہانی شروع ہوتی اور ارتقا کی منزلیں طے کرتی ہوئی انجام کی طرف بڑھتی رہتی ہے اور یہ سوالیہ نشان آہستہ آہستہ گھٹتا اور نظر کے سامنے سے غائب ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک واضح ،اطمینان بخش ،مؤثر اور مسکت جواب اس کی جگہ لے لیتا ہے اور کہانی اس جواب پر ختم ہو جاتی ہے۔

اس بات کو کسی اور نقاد نے یوں کہا ہے کہ'' کہانی سوال سے جواب تک کے سفر کا نام ہے۔'' یا یوں کہیے کہ کہانی شروع ہوتی ہے اور شروع ہوتے ہی اس کے سننے اور پڑھنے والے کے ذہن میں ایک سوال اُبھرتا ہے اور اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے وہ واقعات کی رو کے ساتھ یا کرداروں کے عمل کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔اس لیے کہانی سنانے والے کا کام بس اتنا ہے کہ کہانی کو سوال سے شروع کر کے جواب تک پہنچا دے۔امریکہ کی سہل جو،مشین زدہ زندگی میں ہر مشکل کو آسان بنا لینے کے جو نسخے ہر گھڑی ایجاد ہوتے رہتے ہیں اُن میں سے ایک نسخہ کہانی لکھنے کا بھی ہے، بڑا آسان سیدھا سادا اور منطقی نسخہ۔ افسانہ نویسی کے ایک مدرسے میں افسانہ لکھنے کے فن کی تعلیم ایک اُستاد اس جملے سے شروع کرتا ہے:

"Begin at beginning and go on till you come to the end. Then stop."

لیکن بد قسمتی کی بات ہے کہ منطقی اُسلوب کے سانچے میں ڈھلا ڈھلایا یہ نسخہ اس منطق کی بالکل ضد ہے۔جسے میں نے کہانی کی منطق کہا ہے۔مشینی ذہن کی پیدا کی ہوئی اس منطق کی تردید میں کسی دل جلے نے کہانی لکھنے کا جو اصول وضع کیا ہے وہ یہ ہے:

"Begin at the end and go back till you come to the begining .Then start."

''کوئی مانے نہ مانے حقیقت میں کہانی کی منطق یہی ہے اور بظاہر الٹی معلوم ہونے کے باوجود بالکل سیدھی منطق بھی یہی ہے۔''(فن اور فن کار،صفحہ 43-44)

بہت سے نومشقوں کے لیے سید صاحب کی یہ بحث اصول کا درجہ رکھتی ہے، یہی نہیں، اسی کتاب میں ایک اور مضمون'' کہانی اور حسنِ بیان'' ہے۔جس میں وہ اُردو کے مقبول افسانوں کے مؤثر حصوں سے مثالیں بھی پیش کرتے ہیں،اور پھر انہماک سے اپنی بات سننے والوں کو اپنی بصیرت میں شریک کرتے ہیں:

'' کہانی کی تمہید اور خاتمے کے علاوہ اس کی فضابندی میں جس سے افسانہ نگار کو کہانی

کے ہر حصے میں کام لینا پڑتا ہے اسے اسی حسن بیان سے سہارا ملتا ہے۔" (فن اور فن کار، صفحہ 71)

"رات بھیگ چکی تھی۔ چاند جوبن پر تھا۔ گاؤں پر ایک پراسرار خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز آجاتی یا اس وقت رہٹ کی چرخی کے آس پاس کوئی جنگلی بلا بیٹھا دم ہلا رہا تھا اور نہایت انہماک کے ساتھ میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔"

یہ ہے بلونت سنگھ کے افسانے "جگا" کا ایک چھوٹا سا منظر اور:

"زبان اور محاورے ایک ہی تھے۔ مسلمان بچے برسات کی دعا مانگنے کے لیے منہ نیلا پیلا کیے گلی گلی ٹین بجاتے پھرتے اور چلاتے ...... برسو رام دھڑا کے سے ..... بڑھیا مر گئی فاقے سے۔ گڑیوں کی بارات نکلتی تو وظیفہ کیا جاتا ...... پالتی گھوڑا پالکی ...... جے کنہیا لال کی۔ ذہنی اور نفسیاتی پس منظر چوں کہ یکساں تھا لہٰذا غیر شعوری طور پر Approach بھی ایک ہی تھی ...... یہ قرۃ العین حیدر کے افسانے "جلاوطن" کا ٹکڑا ہے، جس میں بیان کی قدرت نے ایک اہم مشاہدے کو لکھنے والے کے علاوہ پڑھنے والے کا تجربہ بھی بنا دیا ہے۔" (فن اور فن کار، صفحہ 71)

سید وقار عظیم صاحب کو اُردو افسانوی تنقید کی روایت میں ایک متخصص کا مقام حاصل ہے۔ اُن کی کتاب "فنِ افسانہ نگاری" اُردو افسانے کی فنی اور تکنیکی مبادیات پر نہ صرف پہلی تفصیلی کتاب کا درجہ رکھتی ہے، بلکہ اب تک بھی پاکستان اور بھارت میں اس موضوع پر جو کچھ شائع ہوا، اس میں اسے ایک اہم درجہ حاصل ہے۔ سید صاحب کا ایک مخصوص پیرایہء اظہار ہے، افسانے کے موضوع، فنی اجزا اور فضا کے بارے میں وہ جانتے ہیں کہ ابھی اُردو میں بہت کم لکھا گیا ہے اِس لیے اُنھوں نے ان موضوعات پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ صنفِ ادب کیوں کہ مغرب سے آئی ہے اِس لیے اُنھوں نے اپنے مشاہدات اور فنی نقطہء نظر کا بیان کرتے ہوئے افسانے کی تکنیک کے حوالے سے مغرب میں ہونے والی تحقیق کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے:

"واقعات اور کرداروں کے بعد تیسرا نمبر وقت اور مقام کا ہے۔ کہانی کی دوسری اصناف سے کہیں زیادہ وقت اور مقام یا زمانی و مکانی پس منظر مختصر افسانے میں اہم بن جاتا ہے، جو کچھ کردار ہے یا جو کچھ وہ کرتا ہے وہ حقیقت میں ایک خاص طرح کے

ماحول یا زمانی و مکانی پس منظر کا نتیجہ ہے۔لیکن کہانی میں یہ پس منظر واقعات اور کرداروں سے قطع نظر ایک اوراہم فنی اہمیت کا حامل ہے مختصر افسانے کا پس منظر واقعات کو حقیقت کا رنگ دینے یا کرداروں کو حقیقی بنانے کے علاوہ ایک نفسیاتی اور نازک فنی تاثر بھی پیدا کرتا ہے۔اس پس منظر سے جہاں ایک طرف کسی خاص وقت اورخاص مقام کی تصویر ہماری نظر کے سامنے آتی ہے،دوسری طرف وقت اور مقام کی ایک خاص کیفیت اور ایک خاص روح ہم پر چھا جاتی ہے اور ہمیں اپنے رنگ میں ڈبو لیتی ہے۔ہر مقام اور ہر وقت میں ایک جذباتی پہلو اور ایک جذباتی لذت ہے۔افسانہ نگار ہمیں اس جذباتی لذت سے روشناس کراتا ہے اور یوں افسانے میں وقت اور مقام ایک منفرد اور نمایاں حیثیت اختیار کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ کبھی کبھی یہی چیز افسانے کا فنی مقصود معلوم ہوتی ہے۔ہم افسانہ نگاری کے فنی ارتقا پر نظر ڈالیں تو ہمیں ہر زبان میں ایسی کہانیاں مل جائیں گی جن کا مقصد ایک خاص ماحول کی کیفیت کا جذباتی اور حسی تاثر پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔کوئی خاص منظر کوئی خاص ماحول اور اس ماحول کا مخصوص مقامی رنگ،اس کے وہ امتیازی نشان ہیں جو اُسے دوسرے مناظر اور فضاؤں سے الگ کرتے ہیں۔''(فنِ افسانہ نگاری،صفحہ 27-28)

مغرب سے استفادے کے باوجود، وہ اپنی بحث کو مانوس تہذیب میں لے آتے ہیں،اور یہ نکتہ منوانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، کہ افسانے کی تحسین اور تفہیم کے لیے قصہ گوئی کی مقامی روایت سے حسیاتی اور تخیلی رشتہ قائم کرنا ضروری ہے،اور اس پر مستزاد ان کی شعر فہمی ، وہ اُردو شعرا کی تمثال آفرینی،کو دنیائے افسانہ سے اس طرح جوڑتے ہیں کہ تخلیقیت ، الگ الگ صنفی دنیا میں مقید نہیں رہتی ، بلکہ افسانے کے سحر کو تخلیقی جوہر کے تناظر میں سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔''فنونِ لطیفہ خیال افزا ہوتے ہیں۔زبان،قلم اور برش جتنی چیزیں ہمارے کانوں اور آنکھوں کے سامنے پیش کرتے ہیں ان سے کہیں زیادہ خود ہمارا خیال ہمارے سامنے لاتا ہے۔کسی لطیف اشارے کو سننے یا دیکھنے کے بعد ہمارا خیال ہمارے سامنے ایک بسیط دنیا کا نظارہ پیش کرتا ہے اور ہم اس لطیف اشارے کی رہبری میں اس کی سیر کرتے ہیں اور یہی دماغی اور روحانی لذت ہے جس کی وجہ سے ہم فنونِ لطیفہ کو جذباتی دنیا میں اتنا اہم سمجھتے ہیں۔اچھے مختصر افسانے بھی اسی لیے پسند کیے جاتے ہیں کہ ان میں لکھنے والے کو بہت سے ایسے نکات

نظر انداز کر دینے پڑتے ہیں جنھیں ہمارا دماغ خود بخود محسوس کرے۔ غالب کے اس شعر کو سنیں۔

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

تو بے ساختہ ہمارا دماغ ہمارے سامنے ایک ایسی تصویر کھینچ دیتا ہے جسے شاعر نے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جب مومن نے کہا:

مرے گھر آپ یوں جاتے تھے کس دن

اٹھانا مدعا ہے آستاں سے

تو دل نے جولذت محسوس کی وہ مومن کے لفظوں میں نہیں بلکہ اس تصویر میں یا پر لطف واقع میں ہے جو اس شعر کے کہے جانے سے پہلے پیش آچکا ہے۔ مختصر افسانے میں، ایک اچھے مختصر افسانے میں اس چیز کا ہونا اُس کے حسن کا ایک لازمی جزو ہے۔

سید وقار عظیم کی تربیت ایک روایتی فضا میں ہوئی تھی اور وہ کافی وضع دار شخص تھے۔ اپنے پہناوے اور اظہار واسالیب میں بھی جو اپنی وضع داری پر قائم رہے اس کے باوجود وہ نوجوانوں سے محبت کرتے تھے اور انھیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں تبدیلیوں کا احساس تھا اور وہ یہ جانتے تھے کہ تجربات ہی روایات کو تازگی اور وسعت دیتے ہیں۔ مگر وہ اس بات سے خائف بھی ہوتے تھے کہ جدت کے شوق میں نئے تخلیق کار کسی دلدل میں بھی پھنس سکتے ہیں۔ یہ اور بات کہ ان کا انتباہ کرنے کا انداز بھی بڑا نرم اور شیریں ہے:

> ''کبھی کبھی ایک نیا انداز بیان اس فرسودگی میں کوئی ایسا نیا پن پیدا کر دیتا ہے کہ پرانی چیز کے عیب اور اس کی اکتاہٹ چھپ جاتی ہے۔ لیکن ہمیشہ ایسا ممکن نہیں۔ کبھی نہ کبھی یہ راز فاش ہوتا ہے اور پھر افسانہ نگار کا افسوں ہمیشہ کے لیے ختم سا ہو جاتا ہے۔ افسانہ نگار خود بھی عموماً اس طرح کے انجام سے واقف ہوتے ہیں، اس لیے وہ بعض دوسری پیچیدہ راہیں اختیار کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ ایسی چیزوں کو افسانے کا موضوع بنا لیتے ہیں جن میں وقتی کشش ہوتی ہے اور یہ وقتی کشش پڑھنے والوں کو اپنی طرف مائل کر کے افسانہ نگار کے لیے وقتی سرور کا سامان مہیا کر دیتی ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کشش اور سرور دونوں کو ثبات نہیں۔ اس لیے کہ افسانہ نگار نے جس خیال کو اپنے

افسانے کا موضوع بنایا ہے۔اس میں کوئی مستقل قدر نہیں اور مستقل قدر کی کمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ موضوع میں وقتی ہنگامے کا سامان ضرور پیدا ہو جاتا ہے ،لیکن اس میں تاثیر کی پختگی نام کو نہیں ہوتی ۔اس طرح کے موضوع کی مثال میں وہ افسانے پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں جنس کے سطحی جذبات اور ان کے مادی نتائج کی تصویریں ہوتی ہیں یا جو افسانے کسی ایک فرقے یا گروہ کی خوشنودی کے لیے کسی دوسرے فرقے یا گروہ کی زندگی کو ملامت یا جذباتی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک دوسری چیز جسے بعض افسانہ نگار جدت پسندی کے دھوکے میں برتنے لگتے ہیں یہ ہے کہ وہ اپنے افسانہ کی بنیاد ایسے خیال یا واقعہ پر رکھتے ہیں جس میں ان کے نزدیک کوئی جدت ہے ۔جس موضوع سے وہ خود اچھی طرح واقف نہیں ہیں،ان کا خیال ہے کہ دوسرے بھی اس سے نہ آشنا ہیں ۔اس موضوع کے اونچ نیچ کو اچھی طرح پہچانے بغیر وہ اس میں کود پڑتے ہیں اور اس کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو تیرا کی سے اچھی طرح واقف نہ ہونے والے اس تیراک کا جو اندھا دھند گہرے پانی میں کود پڑے۔"(فنِ افسانہ نگاری،صفحہ 67-68)

فن افسانہ نگاری 1935 میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی اُس وقت اُردو میں افسانہ نگاری اپنی ابتدائی منازل میں تھی اس لیے کتاب کے دیباچے میں سید وقار عظیم نے لکھا:

"میرا خیال یہ ہے کہ ابھی ہمارا ادب ایسی منزل تک نہیں پہنچا کہ وہ سخت تنقید کے بار کا متحمل ہو سکے ۔ابھی اسے پروان چڑھانے کی ضرورت ہے اور اس لیے اپنی ادبی تخلیقات پر تنقید کرتے وقت ان کے محاسن پر زور دینا چاہیے۔

"تنقید کرتے وقت میں نے برے پہلوؤں کو قطعاً نظر انداز تو نہیں کیا لیکن انھیں محاسن کے مقابلہ میں ذرا نرمی سے بیان کیا ہے۔"(فنِ افسانہ نگاری،صفحہ 5)

"ہمارے افسانے کے دو حصے ہیں" پہلا آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جن کے عنوان درج ذیل ہیں:

پہلا باب: ابتدا اور ارتقا

دوسرا باب: مقامی رنگ

تیسرا باب: اصلاحی مقصد

چوتھا باب: ترجمے

پانچواں باب: عورت کا تصور

چھٹا باب: محبت اور نفسیات

ساتواں باب: چند دوسری روشیں

آٹھواں باب: مستقبل

دوسرے حصے میں مندرجہ ذیل 26 افسانہ نگاروں کا اجمالی ذکر کیا گیا ہے۔

پریم چند، سدرشن، نیاز، سجاد حیدر، مجنوں گورکھپوری، علی عباس حسینی، اعظم کریوی، احمد شجاع، حامد اللہ افسر، سلطان حیدر جوش، راشد الخیری، قیسی رام پوری، فضل حق قریشی، منصور احمد، حامد علی خاں، شاہد احمد دہلوی، حسن نظامی، ایم اسلم، طالب الہ آبادی، جلیل قدوائی، عابد علی عابد، پطرس، عظیم بیگ چغتائی، حجاب امتیاز علی، مسز عبدالقادر، بلقیس جمال۔

اور پھر کتاب کے آخر میں ''یہ افسانے اور یہ افسانہ نگار'' کے عنوان سے ایک مختصر مضمون ہے، جو اس کتاب میں شامل افسانہ نگاروں کے بارے میں ان کی رائے کا خلاصہ پیش کرتا ہے۔

سید صاحب کی اِس رائے سے اتفاق کرنے کے باوجود کہ اس وقت افسانوی ادب کی تنقید اور خود تخلیق بھی اپنے ابتدائی مراحل میں تھی، جو زیادہ سخت تنقید کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی کتاب پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ سید صاحب نے بہت زیادہ مروت سے کام لیا ہے چناں چہ اس کتاب میں بہت سے ایسے افسانہ نگار بھی شامل ہیں جنھیں بعد میں افسانوی روایت کے اہم نقوش کے انتخاب میں جائز طور پر نظر انداز کیا گیا۔ جیسے قیسی رام پوری، ایم اسلم اور طالب الہٰ آبادی۔

اسی طرح پطرس بخاری دنیائے ادب میں اپنے شگفتہ مضامین کے سبب ایک بہت بڑا مقام رکھتے ہیں مگر افسانہ نگار کی حیثیت سے اُردو ادب میں اُن کا کوئی مقام نہیں۔ اسی طرح سید عابد علی عابد نے بھی نقاد اور شاعر کی حیثیت سے بہت نام کمایا لیکن افسانہ نگار کے طور پر اُنھوں نے کوئی خاص کام نہیں کیا۔ منصور احمد، حامد علی خان اور جلیل قدوائی کا زیادہ کام ترجمے کا ہے اس لیے انھیں کبھی بھی سنجیدگی سے افسانہ نگار خیال نہیں کیا گیا۔ یہی عالم فضلِ حق قریشی کا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا یہ اُردو میں افسانہ نگاری کا ابتدائی زمانہ تھا شاید وقار عظیم صاحب کو ان لوگوں میں مستقبل کے لیے کچھ امکانات نظر آئے ہوں یا اُن سے کچھ توقعات ہوں جو پوری نہیں ہوئیں۔

سید وقار عظیم کی تنقید اور ان کا نقطۂ نظر جانچنے کے لیے چند مثالیں اس کتاب سے دیکھئے:

''نیاز کے افسانے پریم چند یا سدرشن کی طرح مخصوص سوسائٹی کے مرقعے نہیں ہیں۔ غالباً وہ مقامی رنگ یا کسی مقصد کا شامل کرنا افسانہ کے لیے غیر شاعرانہ سا خیال کرتے ہیں جس سے افسانہ کی نزاکت اور حسن کو ٹھیس لگتی ہے۔'' (ہمارے افسانے، صفحہ 106)

مصورِ غم راشد الخیری کے بارے میں جنھیں بعد میں افسانے کے محققین نے اُردو کا پہلا افسانہ نگار قرار دیا، سید صاحب لکھتے ہیں:

''اُردو کے جن افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کو ایک خاص ماحول کی زندگی کی ترجمانی اور مصوری کے لیے مخصوص کر لیا ہے۔ ان میں راشد الخیری کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ راشد الخیری کے اصلاحی افسانوں کی دو خصوصیتیں ہیں جن کی وجہ سے انھیں مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ پہلی خصوصیت ان کے گہرے مشاہدے کی پیدا کی ہوئی ہے اور دوسری اُن کے طرزِ بیان کی ہے۔ افسانہ نگار نے مسلمانوں کے گھرانوں کی معاشرتی زندگی کا مشاہدہ اتنی باریک بینی سے کیا ہے، اور مسلمان عورتوں کی فطرت اور ان کی طرزِ رفتار و گفتار حتیٰ کہ ان کی ذہنی کیفیتوں کے متعلق ان کی معلومات اتنی مکمل ہیں کہ ہر افسانہ زندگی کی بھرپور تصویر کا حامل ہے۔ اس تصویر کے نقوش میں آب و رنگ ان کے طرزِ بیان نے بھرا ہے۔ صاف، سادہ لیکن مؤثر زبان اور اس میں حسبِ ضرورت رنگینی اور ظرافت کا شیریں امتزاج ان واقعوں کو اور کامیاب بناتا ہے...... راشد الخیری کے افسانے بظاہر فن کے احساس سے عاری ہیں اور اس لیے ان میں پریم چند، نیاز یا یلدرم کے افسانوں کی سی بات تو نہیں لیکن ان کے اصلاحی مقصد نے انھیں محض پند و نصیحت کا خشک مجموعہ بھی نہیں بنایا۔''

(ہمارے افسانے، صفحہ 142)

ایم اسلم کے بارے میں ان کی رائے ان کی نرم دلی کی آئینہ دار ہے وہ لکھتے ہیں:

''ایم اسلم اُردو کے سب سے کثیر الرقم افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اُردو میں صدہا افسانے لکھے ہیں۔ لیکن ان صدہا افسانوں میں سے مشکل سے چند ایسے ہوں گے جنھیں بے مقصد کہا جا سکے۔'' (ہمارے افسانے، صفحہ 157)

افسانوی ادب پر سید وقار عظیم صاحب کی تیسری کتاب ''نیا افسانہ'' کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ ان کے پانچ مضامین پر مشتمل ہے:

1۔ نئے افسانے سے پہلے
2۔ مغرب کا فن
3۔ زندگی کا پس منظر
4۔ درمیانی کڑیاں
5۔ نیا افسانہ

کتاب کے دوسرے حصے میں مندرجہ ذیل 4 1، افسانہ نگاروں کے فن پر اجمالی تبصرہ ہے:

کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی، اختر انصاری، صادق الخیری، اوپندر ناتھ اشک، احمد علی، محمد حسن عسکری، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی اور دیویندر ستیارتھی ۔اس کے علاوہ ایک اور مضمون ''چند اور افسانہ نگار'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے ،جس میں انھوں نے چھ اور افسانہ نگاروں کے فن پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے، اور وہ افسانہ نگار ہیں، غلام عباس، ممتاز مفتی، بلونت سنگھ، شفیق الرحمٰن، صدیقہ بیگم سیوہاروی اور قرۃ العین حیدر۔

کتاب کے ایک باب میں ہندوستان کی اس سماجی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کی جھلک دکھائی گئی ہے، جو بعد میں اُردو افسانہ کا ذکر کرنے والے ترقی پسند یا عمرانی ناقدیں کا شیوہ بن گیا، سید صاحب لکھتے ہیں:

> ''مشرق اور مغرب کا جو تصادم برسوں ہوئے شروع ہو چکا تھا، وہ اب بھی جاری تھا۔مغرب، مشرق پر غالب آ رہا تھا، ہندوستان کی رگوں میں مذہبی اختلافات کا زہر آہستہ آہستہ سرایت کر رہا تھا، مسلمانوں میں نئے فرقے پیدا ہو رہے تھے، ہندوؤں میں روشن خیالی آ رہی تھی ......جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے ساتھ توہین آمیز سلوک ہو رہا تھا ، وہ اس سلوک کے خلاف بغاوت کر رہے تھے ، ''خواجگی''، ''غلامی'' کے آگے جھکتی دکھائی دے رہی تھی ، بہادروں کی بغاوت نے جابروں کی آنکھیں کھول دیں۔جس ہندوستان کے دیہاتی بھوکے مر رہے تھے، اس کے شہریوں نے پہلے سے زیادہ شدت سے زندگی کے زخموں کا ذمہ دار سیاسی غلامی کو سمجھنا شروع کر دیا ۔......جو دھواں اب تک اندر ہی اندر گھٹا اور دبا ہوا تھا، ایک نئی ہوا نے اسے شعلے کی

شکل دے دی ..... جنگ ختم ہو گئی، ساری دنیا کے ساتھ ہندوستان کی فضا میں ایک پھیلاؤ پیدا ہوا، جو چیزیں اب تک دبی گھٹی تھیں، جیسے کسی قید سے نکل کر باہر آ گئیں۔'' (نیا افسانہ، صفحہ 49-51)

افسانہ نگاروں پر تبصرہ کرتے ہوئے، اُردو کے صفِ اول کے افسانہ نگار بیدی کے بارے میں وقار عظیم بڑی بے باکی سے بات کہہ جاتے ہیں:

''بیدی اُردو کے سب سے زیادہ جذباتی افسانہ نگار ہیں اور ان کی افسانہ نگاری کا ہر پہلو اسی گہری جذباتیت کا پیدا کیا ہوا ہے۔'' (نیا افسانہ، صفحہ 93)

مگر پھر ان کی وضع دار طبیعت وضاحت کی طرف آمادہ ہوتی ہے:

''بیدی کی جذباتیت میں خطیبانہ جوش کی جگہ ایک ہمدرد انسان کی سی نرمی اور دردمندی ہے اور شاعری کی گھلاوٹ اس میں اونچے اور فہم سے دور رہنے والے فلسفے اور کتابوں سے سیکھی ہوئی نفسیات کا جھوٹا سہارا نہیں۔ یہ جذباتیت دنیا کے دکھ درد کو بھیا نک بنا کر پیش کرنا بھی نہیں جانتی، اسے اپنی دیکھی ہوئی ہر چیز کو کاغذ پر اگل دینے کا شوق بھی نہیں۔ یہ جذباتیت دنیا کی اچھی اور بری بہت سی چیزوں پر گہری نظر ڈالنے کی عادی ہے۔'' (نیا افسانہ، صفحہ 93)

اور آپ محسوس کر سکتے ہیں کہ اب یہ محض دل داری نہیں بلکہ بیدی کے اصل جوہر کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ اس کے علم یا مطالعہ اور تفکر نے اس کے اندر سے انسانیت کے لیے دردمندی اور گرم جوشی کو ماند نہیں پڑنے دیا تھا۔

پریم چند کے بعد بلاشبہ اشک کا نام اُردو افسانے کی روایت میں آتا ہے اور اس افسانہ نگار کے بعض تعصبات اور خود پسندی کے باوجود اس کے بعض افسانے اُردو کے یادگار افسانوں میں شامل ہیں، سید صاحب لکھتے ہیں:

''اُوپندر ناتھ اشک اُردو میں اس زمانے سے افسانے لکھتے ہیں جب کتابوں کے انتساب اور ان کے مقدمے دونوں نثر میں نہیں نظم میں لکھے جاتے تھے اور افسانوں میں صرف تاریخ، اخلاق، رومان اور شاعری کی ترجمانی کی جاتی تھی۔'' (نیا افسانہ، صفحہ 134)

حسن عسکری نے بلاشبہ افسانہ ترک کر دیا، مگر انھوں نے جو کچھ لکھا، وہ افسانے کے طالب علموں

کے لیے جہانِ حیرت کا درجہ رکھتا ہے۔وقار عظیم صاحب ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حسن عسکری کے افسانے .....جن میں پلاٹ ہے اور پلاٹ نہیں ہے، جو کردار نگاری کے بڑے اچھے اور بڑے بُرے نمونے ہیں، جو عریاں نہیں ہیں، جو ان میں ہے، وہ ان میں نہیں ہے یا جو کچھ ان میں نہیں ہے، وہ ان میں ہے، کتنی عجیب سی بات ہے۔ لیکن یہی عجیب سی بات حسن عسکری کے افسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔''

(نیا افسانہ، صفحہ 151)

اسی طرح وہ اُردو کے نقاد اور افسانہ نگار اختر اورینوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اختر اورینوی کو اُردو داں طبقے نے سب سے پہلے ان کی دیہاتی کہانیوں کی وجہ سے جانا ہے اور اس کی ایک خاص وجہ تھی۔لوگوں نے یو۔پی کے دیہات کی بے شمار کہانیاں پڑھی تھیں،اسی اثر سے پنجاب کے دیہاتوں کی اکا دکا کہانیاں بھی وقتاً فوقتاً رسالوں میں چھپنے لگیں اور پڑھنے والوں نے یہ محسوس کیا کہ یو۔پی کے دیہاتوں کی لاتعداد کہانیاں پڑھ چکنے کے بعد بھی پنجاب کے دیہاتوں کی کہانیوں میں ایک لذت اور نیا رنگ ہے۔اختر اورینوی نے بہار کے دیہاتوں کی کہانیاں لکھیں اور وہ بہار جسے زلزلوں نے پہلے سے کہیں زیادہ دلوں اور ذہنوں سے قریب کر دیا تھا،اختر اورینوی کی کہانیوں میں چلتا پھرتا ان کے سامنے آ گیا۔اور بہت تھوڑی سی کہانیاں لکھنے کے بعد ہی سے اُردو کے نئے افسانہ لکھنے والوں میں انھیں ایک ممتاز جگہ دی جانے لگی۔''(نیا افسانہ، صفحہ 173)

د) ڈرامے کی تنقید

سید وقار عظیم کی ڈرامے کی تنقید پر پانچ کتابیں دستیاب ہیں جو درج ذیل ہیں:

1۔ آغا حشر اور ان کے ڈرامے
2۔ اندر سبھا مع شرح
3۔ چند قدیم ڈرامے تعارف اور تجزیہ، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔
4۔ اُردو ڈراما فن اور منزلیں، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن
5۔ اُردو ڈرامہ تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔

پانچویں کتاب دراصل تیسری اور چوتھی کتاب کا مجموعہ ہے۔

اب ذرا سید وقار عظیم کی اس تنقیدی بصیرت اور علمیت کی کچھ جھلکیاں دیکھ لیں جس سے اُردو ڈرامے کی تنقید اور تحقیق فیض یاب ہوئی ۔''آغا حشر اوران کے ڈرامے'' میں ایک طویل مقدمہ ہے جس کو تین عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔

1۔ ڈرامہ اوراس کا فن

2۔ ڈرامہ آغا حشر سے پہلے

3۔ آغا حشر کا فن

اس کے علاوہ اس کتاب میں آغا حشر کے تین ڈرامے''اسیر حرص''،''خوبصورت بلا''،''یہودی کی لڑکی'' شامل ہیں۔

سید وقار عظیم نے عام طور پر اُردو ڈرامے کی روایت پر بھی توجہ دی، مگر اس میں ان کی دل چسپی کا محور وہی ڈرامے اور ڈرامہ نگار رہے، جو ایم ۔اے اُردو کے نصاب میں شامل تھے ان میں سرفہرست نام آغا حشر کا ہے، جن کی وفات لاہور میں 28 دسمبر 1935 کو ہوئی تھی ۔اُردو کے اس مقبول ترین ڈرامہ نگار کے ساتھ بھی یہ ہوا کہ اس کے ڈراموں کا متن بعض اداکاروں کی یادداشت کے بھروسے پر کم اہلیت کے کاتبوں سے لکھوا کر بہت ہی ستے طریقے سے چھپوایا گیا تھا، سو ضرورت تھی کہ سید وقار عظیم جیسے باوسیلہ (شاگردوں کی صورت میں معاون، معتبر کتاب خانوں تک رسائی اور پبلشرز میں ساکھ) محقق اور نقاد اس کام پر توجہ دیتے، چناں چہ ایسے ہی ہوا،''آغا حشر اوران کے ڈرامے'' 1954 میں شائع ہوئی مگر اس کے تیسرے ایڈیشن (1975) میں ان کی جانب سے 1967 کا لکھا ہوا ایک تفصیلی مقدمہ (صفحہ 13 تا 104) سید صاحب نے شامل کیا، جس سے وہ اُردو ڈرامے کے اہم ناقدین اور محققین کی صف میں بھی شامل ہو گئے ۔اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں، جس پر 20 مئی 1954 کی تاریخ درج ہے پروفیسر صاحب نے کہا:

> جو کام امتیاز علی تاج یا عشرت رحمانی کے انجام دینے کا تھا اور وہ کسی نہ کسی بناء پر اس کی طرف متوجہ نہ ہو سکیں تو وقار عظیم کو اس کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے'' آغا حشر اوران کے ڈرامے'' کی ترتیب وتدوین کا معاملہ اسی نوعیت کا ہے ......فروری 1950 میں ایم ۔اے (اُردو) کے طلبہ کو ناول اور ڈرامہ پڑھانے کا کام میرے سپرد ہوا تو بعض

دوسری چیزوں کے علاوہ آغا حشر کے ڈراموں کی تلاش شروع ہوئی، بازار میں خاصی تلاش و جستجو کے بعد صرف تین ڈرامے کسی کباڑی کے یہاں سے دستیاب ہوئے۔ کچھ ڈرامے پنجاب پبلک لائبریری میں سے اور کچھ محترمی امتیاز علی تاج صاحب کے کتب خانہ میں ملے۔ پبلک لائبریری اور تاج صاحب کے ذخیرے میں وہ تینوں ڈرامے بھی موجود تھے جو میں نے کباڑی سے خریدے تھے۔ یہ سب ڈرامے لاہور کے ناشر سنت سنگھ نے چھاپے تھے اور کاغذ اور کتابت کے گھٹیا پن کے علاوہ بے شمار اغلاط سے پر تھے......میں نے اپنے کام کی ابتدائی منزلوں میں اُن ہی غلط سلط ڈراموں سے کام چلایا۔لیکن جی یہی چاہتا رہا کہ یہ ڈرامے کسی نہ کسی طرح صحیح ہو کر منظر عام پر آ سکتے۔طالب علموں کی ضرورت کے لیے ان ڈراموں کو بار بار پڑھنے سے کئی فائدے ہوئے ایک تو یہ کہ پڑھتے پڑھتے کتابت اور طباعت کی بعض ایسی غلطیاں درست ہوتی رہیں جو سرسری مطالعہ کے بعد بھی محسوس کی جا سکتی ہیں۔بعض حصوں پر بار بار غور کرنے سے اندازہ ہو گیا کہ ایکٹریا کاتب نے کس لفظ کو کیا بنا دیا ہے۔آغا حشر کے کئی ڈرامے پڑھ کر ان کے اُسلوب و انداز کی بعض خصوصیتیں واضح طور پر سامنے آئیں اور ان خصوصیات کی روشنی میں بعض اغلاط کی درستی آسان ہو گئی۔ اس کے باوجود بعض حصے ایسے باقی رہ گئے جن کی طرف سے پوری تسلی نہیں ہوئی۔ان کے سلسلے میں اپنے بعض ایسے احباب سے رجوع کیا جنھیں آغا حشر کے ڈرامے اسٹیج پر دیکھنے اور آغا حشر سے ملنے کے موقعے ملے تھے۔بہت سے شکوک ان کی مدد سے رفع ہوئے اس ضمن میں، میں اپنے محترم دوست سید امتیاز علی صاحب تاج اور مجی عشرت رحمانی کا خاص طور پر ممنون ہوں۔

......اس مجموعے کے تینوں ڈرامے آغا حشر کے فن کے تین مختلف ادوار کی نمائندگی کرتے ہیں۔آغا حشر نے اپنی فنی تخلیقی زندگی کے مختلف دوروں میں کئی کئی ڈرامے لکھے ہیں خیال یہ تھا کہ ہر دور کا وہ ڈرامہ چنا جائے جسے دوسرے ڈراموں کے مقابلے میں زیادہ شہرت اور قبول عام حاصل رہ چکا ہو۔اس مجموعے کے ڈراموں میں یہ خصوصیت مشترک ہے ......جو ڈرامے اس مجموعے میں شامل ہیں ان کے سلسلے میں

ایک معذرت بے حد ضروری ہے ۔ان ڈراموں کے مزاحیہ حصوں میں بعض فقرے ایسے آ گئے ہیں جو بلا شبہ عامیانہ ہیں لیکن اس طرح کے ٹکڑے خارج کر دینے میں دو قباحتیں پیش آتی ہیں ۔ایک تو یہ کہ کسی ایک ٹکڑے کے نکالنے سے اس کے آگے پیچھے کے بہت سے ٹکڑوں کا نکالنا ضروری ہوتا ہے اور اس طرح مکالمے میں وہ روانی باقی نہیں رہتی جو مصنف کا مقصود ہے ۔دوسری خرابی جو اس سے زیادہ شدید بھی ہے اور اہم بھی ،یہ ہے اگر اس طرح کی عبارتیں ڈرامے سے نکال دی جائیں تو حشر کے ڈرامے کے طالب علموں کی نظر سے ان ڈراموں کی ایک ایسی خصوصیت پوشیدہ رہے گی جو ان کے پورے فن پر اثر انداز ہوئی ۔حشر نے اپنے ڈراموں میں عموماً اور ان ڈراموں کے مزاحیہ حصوں میں خصوصاً عوام کے مذاق کی تسکین کو اپنا مطمح نظر بنایا ہے ۔وہ ابتذال جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے اسی ارادے کا نتیجہ ہے اور اس لیے ہر" طالب علم" کو اسے بہر صورت گوارا کرنا چاہیے ۔''(آغا حشر اور اُن کے ڈرامے،صفحہ 7 تا 11)

اس کتاب میں انھوں نے آغا حشر کے تین ڈرامے''اسیرِ حرص''،'' خوبصورت بلا''،اور''یہودی کی لڑکی'' شامل کیے ہیں،''رستم وسہراب'' کا اس انتخاب میں شامل نہ ہونا تعجب انگیز ہے ۔البتہ اس میں سید صاحب کا مقدمہ خاصے کی چیز ہے،اس مقدمے کے تین حصے ہیں،''ڈرامہ اور اس کا فن''......''ڈراما آغا حشر سے پہلے''......اور......''آغا حشر کا فن'' ۔ پہلے حصے میں ڈرامے کی فنی مبادیات کو توضیحی انداز میں ذہن نشین کرایا گیا ہے ۔ڈرامائی مفاہمتوں کے حوالے سے دو اقتباسات دیکھئے:

''خود کلامی کسی کردار کی ان باتوں کا فنی نام ہے جو وہ کسی دوسرے کو سنانے کے ارادے کے بغیر بلند آواز میں اپنے آپ سے کرتا ہے ۔انسانی زندگی میں اور اس لیے ڈرامے میں بھی ،انسان یا کردار ،کو کبھی کبھی ایسے موقعے پیش آتے ہیں جب وہ دل ہی دل میں دنیا زمانے کی باتیں سوچتا اور ان سے طرح طرح کے نتیجے نکالتا ہے ۔انسان اپنے دل سے جو باتیں کرتا ہے وہ اس کا ایسا راز ہے جس کی خبر خود اس کے سوا کسی اور کو نہیں ۔ناول نگار کو یہ سہولت حاصل ہے کہ وہ قلبِ انسانی کے ان گوشوں کا بھی جائزہ لیتا ہے اور یوں چھپی ہوئی راز کی بات اس پر آشکارا ہو جاتی ہے ۔اس کے برخلاف ڈراما نگار کی رسائی نہاں خانہ دل تک نہیں اور اس لیے وہ کرداروں کے دلوں کی بات

سامعین اور ناظرین تک پہنچانے کے لیے خود کرداروں کو اپنے آپ سے گفتگو کرتا ہوا دکھانے پر مجبور ہے۔ یہی مجبوری ڈرامے کے فن میں ایک مفاہمت کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور جو بات ڈرامے کے دوسرے کرداروں کے لیے ایک راز کی حیثیت رکھتی ہے وہ ڈراما دیکھنے والوں کو معلوم ہو جاتی ہے اور اس غیر فطری بات پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا۔'' (مقدمہ، آغا حشر اور ان کے ڈرامے، صفحہ 23-24)

''اسٹیج کے ڈراموں میں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کردار اسٹیج پر دوسرے کردار سے گفتگو کر رہا ہے۔ لیکن گفتگو کرتے کرتے وہ قدم داہنے یا بائیں ہٹ کر یا کبھی کبھی صرف گردن موڑ کر ایسی بات کہہ دیتا ہے جو دوسرے کردار کی کسی بات کی وضاحت کرتی ہے۔ کسی اُلجھن کو دور کرتی ہے یا کسی گزشتہ یا آیندہ واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس طرح کہی جانے والی نکتہ کی یہ بات گو دوسرے کرداروں کے اتنے قریب رہ کر کہی جاتی ہے کہ وہ لازمی طور پر اسے سُن سکتے ہیں لیکن کردار کا دو قدم ادھر اُدھر ہو جانا یا محض اپنی گردن کو کسی طرف جھکا کر کوئی بات کہہ دینا اس بات کا فنی اشارہ ہے کہ یہاں بات اسٹیج پر کام کرنے والے کرداروں کو نہیں بلکہ سامعین اور ناظرین یا تماشائیوں کو سنانے کے لیے کہی گئی ہے۔ کردار کے اس فنی طرزِ عمل کو اصطلاح میں رخ گیری یا Aside کہا گیا ہے۔'' (آغا حشر اور ان کے ڈرامے، صفحہ 24)

ڈرامے کے فنی اجزا کی بحث کے بعد وقار عظیم صاحب مقدمے کے دوسرے حصے میں آغا حشر سے پہلے اُردو ڈرامے کی روایت پر بحث کرتے ہیں، اس حصے میں پہلے وہ سنسکرت ڈرامے کا ذکر کرتے ہیں، اور اسے بعض حیثیتوں میں یونانی ڈرامے سے بھی ممتاز قرار دیتے ہیں، اس کے آغاز میں مناجات کی روایت کا ذکر کرتے ہیں اور یہ خیال بھی ظاہر کرتے ہیں کہ اس کے اثرات اُردو ڈرامے پر بھی پڑے ہوں گے، مگر اس کے شواہد اس لیے نہیں ملتے کہ اُردو میں یہ کم و بیش ڈیڑھ صدی کا قصہ ہے۔ پھر وہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور سید مسعود حسن رضوی ادیب کی تحقیق کے حوالے سے واجد علی شاہ کے رہس ''رادھا کنہیا'' کا ذکر کرتے ہیں، جسے لکھنؤ کے تاجدار نے 1842 اور 1844 کے درمیان لکھا، اور 1875 کی اپنی تصنیف ''بنی'' میں شامل کیا، ساتھ ہی تفصیل دی کہ کرداروں کی پوشاکوں اور زیوروں پر لاکھوں روپے کیسے خرچ ہوئے۔ لکھنؤ کے شاہی اسٹیج پر کچھ اور جھلکیاں دکھا کر وہ ''اندر سبھا'' کے خالق امانت

لکھنوی کا ذکر کرتے ہیں کہ اس سے لکھنؤ کے عوامی سٹیج کا آغاز ہوا،اس کے بعد اس کی پیروی میں لکھے جانے والے ڈراموں کی تفصیل اور پھر ''اندر سبھا'' کے فنی اوصاف بیان کیے گئے ۔عشرت رحمانی کے حوالے سے ڈھاکہ کے سٹیج پر تجارتی اُردو ڈراموں کو پیش کرنے والی فرحت افزا تھیٹر یکل کمپنی کا ذکر دل چسپی سے خالی نہیں کہ اب یہ اُردو اور پاکستان کا ایک گم شدہ باب ہے ۔1856 میں لکھے جانے والے احمد حسین وافر کے ڈرامے ''بلبل بیمار'' کے منظر کا نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے ۔اس کے ایک مکالمے ''بڑھاپے کی عزت رہ جائے ، کیوں کہ جوان عورت سے پالا پڑا ہے ۔(آغا حشر اور ان کے ڈرامے،صفحہ 63)سید صاحب کی متین طبیعت اس مکالمے میں بھی ''ابتذال اور عامیانہ پن'' کی چھاپ دیکھتی ہے ۔وہ نہیں جانتے تھے کہ لاہور سٹیج پر ان کی وفات کے 30 برس کے اندر ''ضلع جگت'' نہیں ''نتھ جگت'' کا ایک طوفان برپا ہونے والا ہے۔بہر طور اس کے بعد وہ بمبئی ،دلی اور دیگر شہروں میں پارسی تھیٹر کے پیدا کردہ انقلاب کا ماجرا بیان کرتے ہیں ۔وکٹوریہ ناٹک کمپنی اور الفریڈ تھیٹر یکل کمپنی کا ذکر کرتے ہوئے ، احسن اور بے تاب کے علاوہ دیگر کلاسیکی ڈرامہ نگاروں کا ذکر کیا جاتا ہے،جن کے ڈرامے امتیاز علی تاج نے بڑی محنت سے مرتب کر دیے ۔مقدمے کے تیسرے حصے میں ''آغا حشر کا فن'' کے عنوان سے وہ بڑی محنت سے آغا حشر کی شخصیت ،عہد،تخلیقی فضا اور مذاقِ زمانہ کا نقشہ کھینچتے ہیں،ان کے ڈراموں کے بارے میں ایسا مواد پیش کرتے ہیں، جو آج اس حوالے سے تحقیق کی ترقی کے باوجود بہت اہمیت کا حامل ہے ۔اور آخر میں وہ ان کے فن پر انتقادی اعتبار سے اہم باتیں کرتے ہیں،خصوصیت سے یہ دو مثالیں دیکھئے:

''مکالموں اور کرداروں کی شخصیت اور مکالموں میں صحیح فنی مناسبت کا احساس گو حشر کی ڈرامہ نگاری کے اس دور میں بہت کم ہے،لیکن وہ سرے سے مفقود نہیں ،آگے آنے والے دوروں میں یہ تیز سے تیز تر ہوا ہے اور جوں جوں تیز ہوا ہے ،مکالموں میں اشعار اور قافیوں کا استعمال کمتر ہوتا رہا ہے، یہاں تک کہ آخری دور میں کرداروں کا مکالمہ حقیقی زندگی کا عکس اور واضح نقش بن گیا ہے،اس میں نہ شعر سنائی دیتے ہیں ،نہ قافیوں کی جھنکار ۔کرداروں کے بات کہنے کا انداز وہی ہے، جو زندگی اور فن کے صحیح امتزاج سے ہونا چاہیے ۔''(آغا حشر اوراُن کے ڈرامے،صفحہ 100,99)

''حشر نے اپنی ڈرامانگاری کے سب دوروں میں عموماً اور ابتدائی ادوار میں

خصوصاً عوام کو اپنے سامنے رکھا ہے اور اپنے فن کے ذریعے ان کے مخصوص مذاق کی تشفی کے سامان مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ انھیں ذہنی اصلاح کے راستے بھی دکھائے ہیں ۔ یہ دونوں رجحان ان کے ڈراموں میں بالکل شروع سے موجود ہیں ۔ ان رجحانات کا اظہار اُن کے ڈراموں میں جس جس طرح ہوا ہے اس کی طرف بھی چند اشارے کیے گئے ہیں ۔ ان کے علاوہ ان کے ابتدائی ڈراموں میں عوام کو خوش رکھنے کے رجحان کی ایک اور شہادت بھی ملتی ہے ۔ حشر کے ابتدائی ڈراموں میں سے کئی ڈرامے انگریزی ڈراموں سے ماخوذ ہیں یا ان کے آزاد ترجمے ہیں ۔ آغا حشر نے دیکھنے والوں کی تسکین کے لیے اپنی طرف سے تبدیلیاں کی ہیں ۔ صید ہوس، اسیر حرص اور سفید خون کے انجام کو حزن سے طرب میں بدل دیا گیا ہے کیونکہ ان کے دیکھنے والے کسی قیمت پر بھی کہانی کو حزن و یاس پر ختم ہوتے دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے ۔'' (آغا حشر اور اُن کے ڈرامے، صفحہ 101)

''اُردو ڈرامہ فن اور منزلیں'' اِس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔

1۔ فن:

''ڈراما اور اس کا فن''، ''ڈرامے کا فنی تجزیہ''، ''ڈرامے اور زندگی کا باہمی ربط''، ''ڈرامے کے تماشائی''، ڈرامے کی ادبی اور فنی قدریں''، ''یک بابی ڈرامے کا فن''

2۔ منزلیں:

''ڈراما اندر سبھا تک''، ''اندر سبھا کی ادبی خدمات''، ''اندر سبھا کا فنی پہلو''، اندر سبھا کی غزلیں اور گیت''، ڈراما اندر سبھا سے آغا حشر تک''، ''تاج کا ڈراما انارکلی''، ''ہمارے ڈراما نگار'' شامل ہیں ۔

گو اس میں فن کا حصہ تو وہی ہے جو پہلی کتاب کے مقدمے میں شامل ہے ۔ البتہ اس میں ڈرامے کا فنی تجزیہ، ڈرامے اور زندگی کا باہمی ربط، ڈرامے کے تماشائی، ڈرامے کی ادبی اور فنی قدریں اور یک بابی ڈرامے کا فن جیسے مفید مضامین بھی ہیں ۔ جو علی الترتیب امروز لاہور کی 25 اکتوبر 1959، 14 اگست 1959، استقلال لاہور کی یکم جولائی 1959، ماہِ نو کراچی کی جنوری 1960 اور فنون لاہور کی اپریل مئی 1964 کی اشاعتوں میں شائع ہوئے ۔ ان میں سے آخری مضمون کا ایک اقتباس دیکھیے:

''کہا جاتا ہے کہ ڈرامہ نگار کا تصور جب داخلی تزکیہ اور تزئین کے مختلف مرحلوں سے

گزر رہا ہوتا ہے تو ڈرامہ نگار بغیر کسی طرح دخل دیے ایک طرف کو کھڑا یہ تماشا دیکھتا رہتا ہے ۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا یہ تماشائی جو بظاہر غیر جانبدار معلوم ہوتا ہے حد درجہ جانبدار رہوتا ہے ۔وہ ارادی دخل دیے بغیر بھی بالواسطہ اس سارے فنی عمل میں پوری طرح شریک ہوتا ہے اس لیے کہ شکست وریخت اور داد وستد کے اس تمام ترعمل کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ ڈرامہ نگار نے زندگی کو گہری نظر سے دیکھنے انسانی فطرت کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس کی نزاکتوں کو سمجھنے اور پڑھ کر سوچنے میں کتنا وقت صرف کیا ہے اور ان میں سے ہر چیز کو کس طرح اپنی شخصیت کے رگ وپے میں شامل کر کے اسے ایک مضبوط اکائی کی صورت دی ہے ۔مشاہدہ اور مطالعہ ایک طرف ،جس سے ڈرامہ نگار، ڈرامے کا موزوں اور مؤثر مواد فراہم کرتا ہے اور مشاہدے اور مطالعے کی مدد سے حاصل کیے ہوئے زندگی کے تجربات اور خیالات کو جذبے، فکر اور تخیل کی آنچ دیتے رہنے کی مسلسل عادت دوسری طرف ،ڈرامہ نگار کو اچھا ڈرامہ نگار بناتی ہے اور یہ عادتیں بلا شبہ مختصر ڈرامے کے مصنف کے لیے طویل ڈرامے کے مصنف کے مقابلے میں اس لیے زیادہ اہم ہیں کہ مختصر ڈرامے کی فنی حدود اس سے ہر مرحلے پر زیادہ واقفیت ،زیادہ احتیاط اور زیادہ ضبط کا تقاضہ کرتی ہیں اور ترک واختیار اور حسن وترتیب کے فنی لوازم کی پابندی کرتے ہوئے ہر جگہ اہم اور غیر اہم ،فطری اور غیر فطری، حقیقی اور غیر حقیقی اور مؤثر اور غیر مؤثر کے درمیان نازک امتیاز قائم رکھنا پڑتا ہے اور یہ بوجھ بہت بڑا ہے جو طویل ڈرامے کے مصنف کو اٹھانا پڑتا ہے ۔''(اُردو ڈراما تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ ،صفحہ 132)

''اندر سبھا'' کی ادبی حیثیت میں سید صاحب کا مخصوص دل نشیں اُسلوب اپنے نئے مداح پیدا کرتا ہے:

''ہمارے ڈرامے کا سارا ادبی اور فنی تخیل اندر سبھا سے ماخوذ ہے اور اپنے ابتدائی دور میں ہمارے ڈرامے کی ساری روایت اندر سبھا کی دی ہوئی روایتوں پر قائم ہے ۔کہانی کا فوق الفطرت اور تخیلی ماحول ،رقص وموسیقی کا غلبہ، ڈرامے میں قصے کہانی کی ایک ثانوی اور ضمنی حیثیت ،کرداروں کی گفتگو اور عمل میں شخصیت کا واضح فقدان اور فن کو بنیادی طور پر دل چسپی ،تفریح اور نشاطِ طبع کا ایک وسیلہ بنانے کا غالب

رجحان ......اپنے بمبئی والے دور میں ہمارا ڈراما ان خصوصیات کا حامل ہے۔لیکن ان ساری خصوصیات میں رقص و سرود کی حیثیت ایک محور کی سی ہے جس کے گرد باقی ساری چیزیں گردش لگاتی ہیں ۔ان ابتدائی ڈراموں میں قدم قدم پر گھنگروؤں کی جو جھنکار اور نغموں کی جو گونج سنائی دیتی ہے۔وہ اندر سبھا کے پیدا کیے ہوئے رقص و نغمہ کی صدائے بازگشت ہے اور یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات اندر سبھا کے نغموں اور اس کے زیر اثر لکھے جانے والے ڈراموں میں نمایاں طور پر وہی فرق نظر آتا ہے جو اصل اور نقل میں ہونا چاہیے۔۔یوں کبھی کبھی ان میں سے بعض میں "نقش ثانی" کی رنگینی بھی جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔"(اُردو ڈراما تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ،صفحہ 154)

چند قدیم ڈرامے،تعارف اور تجزیہ:

چند قدیم ڈرامے، تعارف اور تجزیہ سید وقار عظیم کے ان دیباچوں یا تعارف ناموں پر مشتمل ہے جو اُردو کے کلاسیکی ڈرامے کے نام سے مجلسِ ترقی ادب سے شائع ہونے والی پانچ جلدوں میں شامل ہیں۔"چند قدیم ڈرامے تعارف اور تجزیہ" اور "اُردو ڈرامہ فن اور منزلیں" کا جدید ایڈیشن "اُردو ڈرامہ تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ" کے نام سے مرتب کر کے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے 1996 میں الوقار پبلی کیشنز لاہور سے شائع کیا۔

مجلسِ ترقی ءادب کے زیرِ اہتمام اُردو کے کلاسیکی ڈراموں کو مرتب کرا کے شائع کرانے کا جو پروگرام تھا،اس کے تحت سید امتیاز علی تاج کو یہ کام کرنا تھا۔مگر ان کی وفات کے بعد یہ کام ادھورا رہ گیا۔ تاج صاحب کی مرتبہ آٹھ جلدیں (1-6-8) مجلس نے شائع کیں۔مگر ساتویں "کریم الدین مراد کے ڈرامے" جولائی 1972 ،نویں "نامعلوم مصنفین کے ڈرامے" جولائی 1972 ،دسویں "حافظ عبداللہ کے ڈرامے" اگست 1971 ،گیارہویں "متفرق مصنفین کے ڈرامے" مئی 1973 ،اور تیرہویں جلد "طالب بنارسی کے ڈرامے" جون 1975 میں شائع ہوئی تو یہ بات سامنے آئی کہ ان کتابوں کے سرِ ورق پر مرتب کے طور پر امتیاز علی تاج کا نام ہے،مگر یہ کام سید وقار عظیم نے کیا۔(چناں چہ ان کتابوں میں وقار عظیم صاحب کے پیش لفظ بھی شامل ہیں) بلکہ سید معین الرحمٰن نے تو یہ دعویٰ کیا ہے کہ وقار عظیم بارہویں جلد بھی مرتب کر چکے تھے،مگر اب اس کا مسودہ مجلس کے ریکارڈ میں دستیاب نہیں ۔("چند قدیم

ڈرامے''،صفحہ 14) ڈاکٹر معین الرحمٰن نے چند قدیم ڈرامے، تعارف اور تجزیہ میں یہ تمام دیباچے شامل کر دیے، جو مذکورہ جلدوں میں وقار صاحب نے لکھے تھے اِن کی تفصیل یہ ہے:

1۔ اُردو کا پہلا نثری ڈرامہ: خورشید
2۔ کریم الدین مراد اور ان کے ڈرامے
3۔ ایک منفرد ڈرامہ: گلستانِ خاندان ہامان
4۔ ڈرامائی ادب میں ایک تجربہ: چترا بکاولی
5۔ غنایئے اور نثری ڈرامے کی درمیانی کڑی: وادیٔ دریا
6۔ ایک قدیم ڈراما: فتنہ و غانم
7۔ جدت پسندی کی مثال: دورنگی دُنیا
8۔ حافظ عبداللہ اور ان کے ڈرامے
9۔ ایک مقبول ڈراما: لیلیٰ مجنوں
10۔ ایک غنائی ناٹک: شکنتلا
11۔ ایک منظوم معاشرتی ڈراما: نگاہِ غفلت
12۔ زندگی سے قریب ایک ڈراما: دلیر دل شیر
13۔ ایک دلچسپ اسٹیج ڈراما: راجا گوپی چند
14۔ ایک پر کشش ڈراما: گل روز رینہ
15۔ ایک مقبول غنائیہ: فسانہ عجائب شامل ہیں۔

قدیم ڈراموں پر سید وقار عظیم صاحب کا کیا جانے والا یہ کام میرے نزدیک ایک مثال کا درجہ رکھتا ہے۔ یوں بھی ڈرامے کے فن اور تکنیک سے متعلق جو بنیادی اُصول وقار صاحب نے بتائے آج تک ڈرامے کی تنقید انھی اُصولوں پر کارفرما ہے۔ اُنھوں نے اُردو ادب کو ڈرامے کے فن میں تمام جدید و قدیم نظریات و خیالات سے وسعت بخشی ہے۔ اُن کے مضامین کا مجموعہ ''اُردو ڈراما۔ فن اور منزلیں'' وہ دستاویز ہے جو آج بھی برصغیر میں اُردو ڈرامے کے فن پر انتہائی بنیادی اور معتبر حوالہ ہے۔

''وقار عظیم صاحب بیسویں صدی کے ایک بہت ہی معتبر نقاد اور مشفق اُستاد تھے۔ دونوں حیثیتوں سے ان کا مقام بہت اُونچا ہے۔ اُردو داستانوں اور افسانے پر ان کا کام ایسا مستند ہے کہ بیسویں صدی کی

ہر بڑی علمی اور ادبی شخصیت نے اس کا اعتراف کیا ہے۔اُردو ڈرامے پر جو مضامین اُنھوں نے لکھے اور جواُن کی کتاب ''اُردو ڈراما۔تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ'' میں شائع ہوئے ہیں ان کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ڈرامے میں ان کی دل چسپی اور ڈرامے کے فن پہ ان کی نظر کتنی گہری تھی۔ یہ کتاب اُردو کا نہایت اہم سرمایہ ہے۔''(ضیا محی الدین، پدرم سلطان بود، صفحہ 315)

☆☆☆

باب چہارم:

سیّد وقار عظیم کی اقبال شناسی

علامہ اقبال سے سید وقار عظیم کی وابستگی چند برسوں کی اتفاقی یا احتیاجی بات نہیں بلکہ یہ ذہنی تعلق قریباً نصف صدی پر محیط ہے۔اس میں شک نہیں کہ اردو ادبیات کی تدریس سے وابستہ کسی معلم کے لیے اقبالیات بھی مطالعے کا محور ٹھہر سکتی ہے مگر یہاں یہ محض تدریسی ضرورتوں کی بجا آوری کے لیے ہی نہیں،ان کے تنقیدی کام سے اندازہ ہوتا ہے کہ فکرِ اقبال سے جس لگاؤ کا اظہار انھوں نے جا بجا اپنی تحریروں اور تقریروں میں کیا، وہ ان کی وارداتِ دل ہے۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سے ایک ملاقات کے دوران سید وقار عظیم نے علامہ اقبال کے ساتھ اپنی ذہنی وابستگی کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

> ''یہ 1925۔1926 کا زمانہ تھا، میں سکول میں پڑھتا تھا۔ہمارے نصاب کی کتاب میں اقبال کا منتخب کلام شامل تھا۔یہ انتخاب چند نظموں: بچے کی دُعا، ترانۂ ہندی، نیا شوالہ، جگنو، ہمالہ اور ایک آرزو پر مشتمل تھا۔یہیں سے اقبال کے ساتھ میری دل چسپی کا آغاز ہوا۔''(اقبالیات کا مطالعہ، صفحہ 11)

جیسے جیسے تحریک آزادی میں مسلمانانِ برصغیر کی ملی شناخت اور حقوق کے مباحث شامل ہوتے گئے ،اقبال کے کلام اور فکر سے نوجوان وقار عظیم کی دل چسپی بھی بڑھتی گئی،اسی رنگ نے ان کے شوق کو وارفتگی میں تبدیل کیا اور پھر ان کا بحیثیت معلم تقرر ان کی اقبال شناسی کو مزید جلا بخشنے کا موجب بنا۔اورینٹل کالج لاہور میں سید وقار عظیم نے 1950 سے 1970 تک اقبالیات کا پرچہ پڑھایا تو انھیں اقبالیات کو مزید سمجھنے کا موقع ملا۔اسی اقبال فہمی نے ان سے متعدد اہم مضامین تخلیق کروائے جو انھیں بحیثیت اقبال شناس ہم سے متعارف کرواتے ہیں۔یہ مضامین مختلف رسالوں میں چھپتے رہے۔ریڈیو پر ان کی تقاریر، یومِ اقبال کی تقاریب میں ان کے خطبات اور اقبال سیمینار میں ان کے خصوصی لیکچرز کی بدولت انھیں معیار اور مقدار دونوں صورتوں میں اقبال شناس کا رتبہ ملتا گیا۔

اقبال سے متعلق وقار عظیم صاحب کی تین کتب سامنے آئیں۔جن میں سے ایک کا درجہ تو مستقل

کا ہے،جس میں ان کے مضامین شامل ہیں یعنی''اقبال۔شاعر اور فلسفی''، مکتبہ عالیہ لاہور، (دسمبر 1968) جب کہ''اقبال معاصرین کے نظر میں''، (مجلس ترقی ادب لاہور، دسمبر 1973)ان کی مرتبہ کتاب ہے،ان کے علاوہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن مرحوم نے ایک کتاب''اقبالیات کا مطالعہ''اقبال اکیڈمی لاہور سے نومبر 1977 میں اقبال کے یوم ولادت کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے کی یادگاری کتابوں میں شائع کرائی، جس میں سید وقار عظیم کے مطبوعہ مگر غیر مدون مضامین اور انٹرویو شامل کیے گئے۔

''اقبال، شاعر اور فلسفی''علامہ اقبال پر لکھے گئے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقار صاحب نے 1950 سے 1968 کے دوران لکھے اور مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے جب کہ سید صاحب کی اپنی مرتبہ کتاب''اقبال معاصرین کی نظر میں''اقبال پر لکھے گئے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو خود شاعرِ مشرق کی زندگی میں لکھے گئے۔سید وقار عظیم لکھتے ہیں،''یہ اقبال کے فکر و فن اور بعض صورتوں میں اقبال کی شخصیت سے متعلق ایسے مضامین کا مجموعہ ہے، جو معاصرین اقبال نے ان کی زندگی میں لکھے، ایسے قرائن موجود ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان مضامین میں سے اکثر اقبال کے مطالعے میں آئے۔'' (اقبال، معاصرین کی نظر میں، صفحہ 11) تیسری کتاب''اقبالیات کا مطالعہ''سید وقار عظیم کے ان مضامین، انٹرویوز اور متفرقات پر مشتمل ہے جو اقبال سے متعلق انھوں نے تحریر کیے لیکن ان کی زندگی میں کتابی صورت میں شائع نہ ہوئے ان سب کو ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے یکجا کیا اور اقبال کے صد سالہ جشن ولادت پر اور سید وقار عظیم کی پہلی برسی کے موقع پر شائع کرایا۔زیادہ مناسب ہوگا کہ ان کی ہر کتاب کا علاحدہ علاحدہ جائزہ لیا جائے۔

☆ اقبال......شاعر اور فلسفی

سید وقار عظیم کو علامہ اقبال سے جو ذہنی و قلبی وابستگی تھی، اور ساتھ ہی ساتھ ایک نوزائیدہ ریاست اپنے تشخص اور ملی ارتباط کے لیے کلام و فکرِ اقبال میں دل چسپی لے رہی تھی، اور عوام کے ساتھ ساتھ جامعات میں بھی اس کے لیے جو پذیرائی کی فضا تھی، اور جامعات اقبال، اقبال سے منسوب چیئرز بھی قائم کر رہی تھیں، اس لیے فکشن سے اپنی پہلی دل چسپی کے باوصف سید صاحب نے ان تصنیفات پر بھی توجہ دی جو فکرِ اقبال پر حوالے کی کتب قرار پائیں۔سید وقار عظیم نے اکیس برس تک اورینٹل کالج لاہور کے تشنگانِ علم کو اقبالیات کا درس دیا اور یہ درس اس خوبی، توجہ، محنت اور لگن سے دیا کہ ان کے بہت سے

شاگرد، ان لیکچرز کو علم آفریں قرار دیتے ہیں۔ اپنے اس مجموعہ مضامین کے محرک کے متعلق سید صاحب نے کہا تھا:

''اس مجموعے کے مضامین میں جو کچھ میں نے کہا ہے اس کی تحریک کا سبب میرے وہ صدہا شاگرد ہیں جنھیں میں انیس سال سے اقبال پڑھا رہا ہوں میں ان سب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے استفسارات سے مجھے سوچ کی راہیں دکھائیں۔''
(اقبال شاعر اور فلسفی، صفحہ 2)

''اقبال، شاعر اور فلسفی'' میں سید وقار عظیم نے اقبال کی فکر کے اہم پہلوؤں کی توضیح کے ساتھ ساتھ ان کے فلسفۂ فن سے اپنی ذہنی ہم آہنگی سے متعلق اپنا نقطۂ نظر کھل کر بیان کیا ہے۔ وہ اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''اقبال کو ساری دنیا فلسفی زیادہ سمجھتی ہے اور شاعر کم۔ لیکن میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اقبال کی حکیمانہ حیثیت بہر حال مسلم ہے لیکن حکیم فرزانہ کی حکمت کو دل نشیں اور دلآویز اقبال کے مزاج کی رچی ہوئی کیفیت نے بنایا ہے اقبال کی حکمت اور شعر کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس مجموعے کے تمام مضامین کی اساس یہی احساس ہے۔''(اقبال شاعر اور فلسفی، صفحہ 2)

یہ مضامین مختلف ادبی رسائل میں چھپتے رہے اور ستمبر 1968 میں وقار صاحب نے انھیں کتابی صورت میں شائع کروایا۔ اس مجموعہ میں کل سترہ مضامین شامل ہیں، جن کی تفصیل زمانی ترتیب کے اعتبار سے درج ذیل ہے۔

1	اقبال کی شاعری کا پہلا دور	ادب لطیف لاہور	مئی 1950
2	اقبال کا نظریہ فن	ماہِ نو کراچی	اپریل 1952
3	اقبال کی نظموں میں رنگ تغزل	اقبال لاہور	اپریل 1953
4	اقبال کی شاعری کا ایک کردار	ماہِ نو کراچی	جون 1953
5	اقبال کی بعض نظموں کا لہجہ	ہمایوں لاہور	اپریل 1954
6	اقبال کا مردِ مومن	استقلال لاہور	5 اپریل 1959
7	اقبال کی اُردو کی غزل	ادبی دنیا لاہور	دسمبر 1959

8	اقبال کی دو نظمیں اور عظمت آدم	امروز لاہور	23 مارچ 1960
9	اقبال اور آزادیٔ فکر و عمل	استقلال لاہور	1961
10	اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عناصر	لیل و نہار لاہور	22 اپریل 1962
11	اقبال ......شاعر یا فلسفی	استقلال لاہور	اگست 1963
12	اقبال کی نظم تسخیر فطرت	استقلال لاہور	اگست 1963
13	اقبال حضور باری میں	اقبال ریویو کراچی	جنوری، مارچ 1964
14	اقبال کی پسندیدہ بحریں	سالنامہ ادب لطیف لاہور	اگست 1964
15	غم فرہاد اور عشرت پرویز	فنون لاہور	جولائی، اگست 1966
16	''خودی'' تشبیہوں کے آئینے میں	اقبال لاہور	اکتوبر 1968
17	اقبال کا ایک مرثیہ	تحریر 1955	نظر ثانی 1968

یہ کتاب 328 صفحات پر مشتمل ہے۔اس کتاب کا انتساب سید وقار عظیم نے اپنے دوست حمید احمد خان کے نام کیا ہے، جو جامعہ پنجاب کے وائس چانسلر تھے،اس کتاب کا سرورق عبدالرحمان چغتائی ایسے نامور مصور نے نقش کیا۔

جیسا کہ ذکر ہوا کہ زیر بحث کتاب کے مضامین 1950 سے 1968 کے دوران لکھے گئے ۔ان سب مضامین کو یکجا کرنا اور کتابی صورت میں لانا آسان کام نہ تھا،مگر ایک اُستاد کا سب سے بڑا سرمایہ اس کے سعادت مند شاگرد ہیں اور اس اعتبار سے سید صاحب بہت خوش نصیب تھے،ان کے بیشتر رفقا اوران کی اولاد بھی ان کا بہت احترام کرتی تھی ، وہ ایک رفیق کار،ایک شاگرد اور ایک بیٹے کا ذکر اس کتاب کی تدوین میں معاونت کے سلسلے میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان مضامین کو یکجا کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا،جیبی ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی،عزیزی معین الرحمان اور اختر وقار سلمہ،کی پیہم مساعی نے میری اس کوتاہی کی تلافی کی اور بکھرے ہوئے مضامین کو جمع کر کے اس قابل بنایا کہ وہ کتابی صورت اختیار کر سکیں۔''

(اقبال شاعر اور فلسفی،صفحہ 2)

بلا شبہ اس کتاب کی اپنی ایک مستقل فکری اہمیت ہے مگر بنیادی طور پر یہ مضامین طلبہ کی ذہنی اپچ کو مدنظر رکھتے ہوئے اوران تک واضح اور مکمل مفہوم پہنچانے کی خاطر لکھے گئے ۔ چناں چہ ایک اور اہم

مدرس نقاد اور ان کے رفیق کار ڈاکٹر سید عبداللہ اس کتاب پر رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''اقبالیات سے متعلق .....ان کی یہ کتاب اچھی کتابوں میں سے ہے۔ہم مدرس لوگ جو کچھ بھی پڑھتے لکھتے ہیں ہمارے پیشِ نظر صرف یہ بات ہوتی ہے کہ ہم اپنے طلبہ کے مسائل،مشکلات اور شکوک کے جواب مرتب کریں تا کہ ان کی دقتیں رفع ہوں اور تعلیم کے اونچے نیچے درجے میں یہ معاملہ ایک مہم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔یعنی طلبہ کے نقطۂ نظر سے سوچنا اور پھر انھیں جدید ترین اعلیٰ تحقیقی نتائج اور ان پر اپنے غور و فکر کی تلخیصات سے آگاہ کرنا۔ان وجوہ سے سید وقار عظیم صاحب کی کتاب میں تحقیق کی جستجو بھی ہے اور اپنے غور و فکر سے پیدا کردہ انکشافات بھی ہیں۔'' (ماہِ نو،لاہور، وقار عظیم نمبر۔مئی 1978 ،صفحہ 21)

اس کتاب میں شامل مضامین کا اجمالی تعارف میں اس لیے ضروری خیال کرتا ہوں کہ اُن کے اس ضمن میں کام کے مختلف پہلو سامنے آجائیں۔

اقبال شاعر یا فلسفی:

کتاب کے نام کی مناسبت سے وقار عظیم صاحب نے اپنی کتاب میں اسے پہلے مقالے کے طور پر منتخب کیا۔یہ مقالہ 12 صفحات پر مشتمل ہے،اقبال کے فلسفہ اور شاعری کے مابین کشمکش تھی یا نہیں،مگر اسے مدرس نقادوں نے خوب ہوا دی۔اس کا ایک اور پس منظر بھی ہے،وہ یہ کہ اقبال کے پیغام نے جس طرح برصغیر کے مسلمانوں کے اندر ملی تشخص کے احساس کو پروان چڑھایا،اس کے پیشِ نظر نوزائیدہ مملکت پاکستان نے اسے اپنے معمار اور مصور کا درجہ دیا،جس کے باعث بھارت میں رہنے والے مسلمان ناقدین کو عام طور پر اقبال کے فن ہی پر لکھنا پڑا (اسلوب احمد انصاری)،اور اگر فکر پر لکھا تو اپنی دانست میں ثابت کرنا چاہا کہ ان کا پاکستان کے تصور سے تعلق نہیں تھا۔(عتیق احمد صدیقی)،دوسرے یہ ہوا کہ ترقی پسند ادبی موقف نے اگر اقبال کی ملوکیت،ملائیت اور تصوف کی مخالفت اور انقلاب پسندی کی تحسین کی تو اس تحریک کے مخالفوں نے اقبال کے فن اور شعری تراکیب و تلمیحات پر توجہ دی۔بہر طور اقبال کے فکر و فن کی تفریق اکثر ناقدین کے یہاں زیرِ بحث آئی،سو اس کتاب میں شامل سید وقار عظیم کا یہ کلیدی مقالہ اس معاملے کی خوبصورت توجیہہ ہے۔جس میں اقبال کو ایک عظیم فلسفی قرار دینے کے ساتھ

ساتھ ان کی شاعرانہ حیثیت کو بھی مسلم قرار دیا گیا ہے:

''اقبال فلسفی اس معنی میں ہیں کہ انھوں نے اپنے مخاطب یا قاری کو زندگی کا ایک مربوط، منظم اور بعض حیثیتوں سے ایک مکمل اور عملی فلسفہ دیا ہے.....اقبال کا یہ مربوط اور منظم فلسفہ ایک گہرے اور شدید جذباتی اور ذہنی تجربے یا واردات کی پیداوار ہے۔ یہ شدید اور ذہنی تجربہ جو اقبال کے مزاج، اُن کی شخصیت او راس شخصیت کے رگ و پے میں سمایا ہوا ہے، جب اُبھرنے کے لیے بیتاب ہوتا ہے اور لفظوں کے پیکر یا سانچے میں ڈھلتا ہے تو کبھی وعظ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے اور کبھی شاعری اور دونوں صورتوں میں دل نشیں بھی ہوتا ہے اور موثر بھی۔'' (اقبال شاعر اور فلسفی، صفحہ 4)

''جو کام مفکر فلسفی نے اپنے ذمے لیا تھا اسے شاعر فنکار نے تکمیل کو پہنچایا۔'' (اقبال شاعر اور فلسفی، صفحہ 14)

اس پورے مضمون میں سید وقار عظیم نے اقبال کی شاعرانہ حیثیت کو ان کے فلسفے کا ہم سفر قرار دیا ہے کہ دونوں نہ صرف ساتھ چلتے ہیں بلکہ ان دونوں کا ایک دوسرے پر انحصار بھی ایسا ہے کہ کہیں بھی ایک، دوسرے پر غالب آنے کی کوشش نہیں کرتا:

''ان کے شعر میں ہمیشہ ایک منزل ایسی آتی ہے جب حکیمانہ حسن اور جمالیاتی حسن ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جاتے ہیں اور جو کام حکمت کے وقار اور سنجیدگی سے بن نہیں پاتا اسے جمال کی رعنائی ایسے انداز میں مکمل کرتی ہے کہ اقبال کی کہی ہوئی بات ہر ایک کے دل کی بات بن جاتی ہے۔'' (اقبال شاعر اور فلسفی، صفحہ 14)

اقبال کی شاعری کا پہلا دور:

15 صفحات پر مشتمل یہ مقالہ اقبال کی شاعری کے اس ابتدائی دور کے بارے میں ہے جو سید وقار عظیم کے مطابق ان کے فکری تخیل و میلان کی طرف پہلا قدم ہے۔ اس سلسلے میں وقار صاحب نے سر عبدالقادر کے بیان کو درست قرار دیتے ہوئے اس رائے سے مدد لی ہے کہ اقبال نے 1901 سے دو تین سال پہلے گورنمنٹ کالج کے مشاعرے میں غزلیں کہنا شروع کیں۔

سید وقار عظیم پہلے دور کی نظموں مثلاً ''گل رنگین، ابر کہسار، آفتاب، آفتاب صبح، گل پژمردہ، ماہِ

نو،موج دریا،چاند،جگنو،صبح کا ستارہ،کنار راوی کا حوالہ دے کرا قبال کی مظاہرفطرت سے دل چسپی کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔''ایک آرزو'' کے بارے میں وہ یہ کہتے ہیں:

''ایک آرزو میں تو شروع سے آخر تک اس والہانہ شیفتگی قلبی تعلق اور گہری اور سچی محبت کا اظہار ہے جو اقبال کو فطرت سے ہے۔''(اقبال شاعری اور فلسفی،صفحہ 31)

ان سب نظموں میں جہاں فطرت کے مظاہر کا بیان ہے وہیں یہ اقبال کے اندر کی بے چینی، اضطراب،ذوق جستجو کی مظہر بھی ہیں۔اس بے چینی کی وجہ سید وقار عظیم کے خیال میں یہ ہے کہ شاعر کو اپنے وطن سے سچی محبت ہے لیکن اہل وطن میں باہمی محبت کی کمی نظر آتی ہے۔رواداری اور کشادگیِ قلب، کی کمی ایک ''قوم پرست'' شاعر کو آزردہ کرتی ہے اور اس آزردگی کا مؤثر اظہار 'صدائے درد' میں ملتا ہے۔

اقبال کے جن افکار نے بعد کے مراحل میں فلسفیانہ صورت اختیار کی اس کے نقوش اولیں اس دور میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔مثلاً عقل و عشق،مردمومن کا تصور، زندگی میں ہر پل جستجو،ذوق عمل وغیرہ، تاہم ابھی یہ آہٹ مدہم ہے۔سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

''اقبال کی آرزو میں ابھی 'بانگِ درا'' کی گونج نہیں،ابھی وہ کسی بھولے بھٹکے قافلے کے رہنما نہیں بن سکے۔''(اقبال شاعر اور فلسفی،صفحہ 31)

اقبال حضورِ باری میں:

36 صفحات پر مشتمل اس مقالہ کے آغاز میں سید وقار عظیم نے اقبال کے نظریات کی مختلف جہتوں کا ذکر کیا ہے اور معترضین اقبال کے اعتراضات کے جواب میں اقبال کے خیالات کا دفاع پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

بادی النظر میں بعض لوگوں کو اقبال کی سوچ اور خیالات میں تضاد نظر آتا ہے کہ اقبال کبھی خودی کا حامی ہے اور کبھی بےخودی کا،وہ کبھی خدا کا عاجز و منکسر بندہ دکھائی دیتا ہے،اور کبھی حرف شکایت لب پر لاتا ہے تو اپنی نوا کو اس حد تک بلند کر دیتا ہے کہ بعض سادہ لوحوں کا دل ڈوبنے لگتا ہے،وہ وطن پرست بھی ہے اور پھر وطنیت کا ایسا مخالف بھی کہ اسے نوع انسانی کے لیے فتنہ خیال کرتا ہے۔کہیں وہ آدم کا وکیل ہے اور کہیں اللہ کی عظمت کا گرویدہ۔سید وقار عظیم نہایت مدلل انداز سے اقبال کی سوچ کے تمام پہلوؤں کو قاری کے سامنے ایک اچھے وکیل اور معلم کی طرح پیش کرتے ہیں۔اقبال کے ہاں اس تضاد کی وجہ وہ

یہ بیان کرتے ہیں کہ اقبال نے زندگی کے مختلف مسائل کا ذکر مختلف انداز میں کیا ہے ۔وقار صاحب کے نزدیک بہ حیثیت مفکر اور فلسفی، اقبال نے زندگی کے مسائل پر تین مختلف طریقوں سے نظر ڈالی ہے اور تینوں طریقوں سے کہیں وہ ''آدم'' کے وکیل ہیں، کہیں ''مسلمان'' کے اور کہیں خود اپنی انفرادی ذات کے۔ان تینوں حیثیتوں میں اقبال کو خالق حقیقی کے سامنے مختلف باتیں کہنی پڑتی ہیں، انھی باتوں کے حوالے سے اظہار خیال میں پائے جانے والے فرق کے سبب بعض لوگوں کو اقبال کے بارے میں ایسی بدگمانی کا موقع ملا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں مسلم اُمہ جس سامراجی استحصال کا شکار تھی، وہی منظر نامہ اقبال کی بے چینی اور اضطراب کا حقیقی سبب تھا اور اسی اضطراب نے ان سے ''شکوہ'' جیسی لازوال نظم تخلیق کرائی، جو مسلمانوں کے دلوں میں مخفی جذبات کی تسکین کا آئینہ یا وسیلہ بنی ۔نظم ''شکوہ'' میں آدم کا انداز جس قدر دردمند گستاخی سے مماثل تھا، ''جواب شکوہ'' میں اسی قدر دعائیہ ہے ۔اقبال بارگاہ ایزدی میں خود کو عاجز انسان کے طور پر پیش کرتے ہیں ۔سید وقار عظیم لکھتے ہیں کہ:

> ''اقبال کی شخصیت تین رخوں پر مشتمل ہے فکری، تخیلی، جذباتی، ان تینوں کا مزاج اقبال کے کلام میں جا بجا دکھائی دیتا ہے، لیکن اس کی مؤثر صورت بارگاہ ایزدی کے حضور اقبال کی مناجات میں زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے۔''(اقبال شاعر اور فلسفی، صفحہ 69)

خودی۔تشبیہوں کے آئینے میں:

18 صفحات پر مشتمل اس مقالے میں وضاحت کی گئی ہے کہ اقبال کے یہاں خودی کے معنی خود پسندی کے نہیں بلکہ خودشناسی کے ہیں اور خودشناسی میں بھی یہ بنیادی نکتہ ذہن نشیں رہے کہ یہ ذات سے زیادہ ممکناتِ ذات کا شعور ہے چناں چہ خودی، جوہرِ حیات ہے اور یوں مومن کی پہچان ہے اور فقر کی متاع بھی ۔سید وقار عظیم کے نزدیک اقبال کے نظریہ خودی کی تفہیم کے لیے تین اہم ماخذ ہیں:

1۔ خطبات
2۔ مراسلات
3۔ اسرار خودی کا مقدمہ

اقبال نے نثر کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی خودی کی توضیح کی ہے، سید وقار عظیم کے نزدیک نثر

میں فلسفیانہ گتھیاں سلجھتی نہیں بلکہ الجھ جاتی ہیں، جب کہ شاعری میں خودی کا مفہوم سادہ، رواں اور دل نشیں انداز میں بیان ہوا ہے۔ اقبال نے خودی کی وضاحت کے لیے مختلف تشبیہات و استعارات کا سہارا لیا ہے، جس پر نقادوں کو اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس طرح بات کرتے ہوئے اقبال کے یہاں فلسفہ کا عنصر کم اور شاعری زیادہ ہو جاتی ہے لیکن سید وقار عظیم کے نزدیک حسن و عشق کی افسانوی روایت میں اقبال کو ایک خاص کشش محسوس ہوتی ہے۔ جو ان کے فلسفہء حیات سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ وقار عظیم صاحب کے نزدیک اقبال کا ذہن حکیمانہ اور قلب شاعرانہ ہے۔ ان کے فلسفیانہ خیال کی ایک مثلث ہے جس کی اساس تین اجزا یا ارکان پر ہے۔ مثلث کا ایک جز تو وہ منزل ہے جس پر پہنچنے سے زندگی حسن اور معنویت سے خالی رہتی ہے۔ دوسرا جز وہ سختیاں اور مصیبتیں ہیں، جو آرزومندی کی آزمائش اور افزائش کے لیے ضروری ہیں۔ جب کہ تیسرا جز ولگن اور ذوق جستجو ہے اقبال اپنی اسی تثلیث کی وضاحت کی لیے علامتوں سے کام لیتے ہیں۔ علامتیں وہی روایتی ہیں مگر بالکل نئے مفہوم میں۔ تلمیحات بھی استعمال کی گئی ہیں، مگر ایک نئے جہاں معانی کی وضاحت کے لیے، یہی وجہ ہے کہ اقبال نے آتش نمرود، ضرب کلیم، فقر بوذر اور ید اللّٰہی وغیرہ کو ایک نئی معنویت سے آشنا کر کے اُردو شعری روایت میں داخل کیا۔ سید وقار عظیم کے نزدیک یہ روایتی علامات و تلمیحات اقبال جیسے ہنر مند شاعر کے ہاتھوں میں آ کر نئے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں۔

اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عناصر:

سید وقار عظیم کا یہ مقالہ 18 صفحات پر مشتمل ہے، جس میں انھوں نے اقبال کو بہترین ڈرامائی نظم نگار قرار دیا ہے، یعنی ایسا تخلیق کار جس نے اپنے خیالات، احساسات اور فلسفیانہ نکات کو بیان کرنے کے لیے دیگر ادبی و فنی وسائل کے ساتھ ساتھ ڈرامے کے فن سے بھی کام لیا ہے۔ اقبال کے ابتدائی دور کی بیشتر نظمیں ڈرامائی عناصر کی حامل ہیں۔ جن میں مکالماتی انداز نمایاں ہے۔ وقار صاحب لکھتے ہیں:

> ''اقبال نے اپنے احساسات اور تاثرات اور بعض اوقات اپنے گہرے فلسفیانہ تخیلات کے اظہار و ابلاغ کے لیے نہ صرف ڈرامائی عناصر کی مدد لی ہے بلکہ انھیں ان فنی وسائل کی فہرست میں نمایاں جگہ دی ہے۔ جو ان کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔'' (اقبال شاعر اور فلسفی، صفحہ 311)

''کلی''،''عبدالقادر''،''ستارہ''،''خطاب بہ جوانان اسلام''،''عقل و دل''،''حقیقتِ حسن'' اور''جبریل وابلیس'' کی مختلف مثالوں کے ذریعے وقار صاحب نے اقبال کے ڈرامائی تاثر کو دل نشیں انداز میں بیان کیا ہے۔

جس طرح ڈراما نگار، مکالموں، کرداروں، مناظر سے کام لیتا ہے۔اسی طرح اقبال نے اپنی نظموں میں کبھی ایک دو عناصر سے اور کبھی بیک وقت سارے عناصر سے کام لیا ہے۔مثلاً''جبریل وابلیس'' کے متعلق سید وقار عظیم لکھتے ہیں''جبریل وابلیس''22مصرعے کی نظم ہے،ان 22مصرعوں میں مکالموں کی ترتیب، خیال کی چستی، اور تصور کی دھیمی اُٹھان نے ایک ایسی وحدت کو جنم دیا اور ایسا ڈرامائی تاثر پیدا کیا کہ شاید ہی اقبال کی کسی اور نظم میں ایسی وحدت موجود ہو۔(اقبال شاعر اور فلسفی،صفحہ 125)

یہاں ایک نکتہ یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے خود رزمیہ ڈرامے کیوں نہیں لکھے؟اس کا جواب سید وقار عظیم کچھ یوں دیتے ہیں:

> ''اگر اقبال اس طرف توجہ کرتے تو اُردو میں بھی کوئی ایسی تخلیق وجود میں آجاتی جسے کہ دوسری''فردوس گم گشتہ'' کہہ سکتے۔''(''اقبال شاعر اور فلسفی''،صفحہ 126)

اقبال کا نظریہ فن:

کتاب کا ساتواں مقالہ 11 صفحات پر مشتمل ہے۔سید وقار عظیم کے نزدیک''اقبال زندگی کا شاعر ہے اور فن کو اس کا خادم جانتا ہے۔''اقبال کے نزدیک فن زندگی ہے تاہم جب تک اس میں مقصدیت نہ ہو وہ ہر قسم کے تاثر سے عاری ہے۔اقبال اپنی شاعری کے ذریعے قوم کے احساسات وجذبات میں زندگی کا رنگ بھرتے ہیں، سوز دروں، جہد وجد اور عمل پیہم۔گویا اقبال کی شاعری جہد مسلسل کا پیغام ہے۔

سید وقار عظیم اس مضمون میں اقبال کے حوالے سے اس معروف خیال کی توضیح کرتے ہیں کہ اقبال نے تخلیق کار کے لیے یہ لازم قرار دیا ہے کہ اس پر اس کی اپنی خودی آشکارا ہو، وہ نگاہِ شوق رکھتا ہو اور نئی آرزو یا نئی جستجو کا متلاشی ہو۔گویا اپنے نصب العین کو جامد نکتہ نہ خیال کرتا ہو، بلکہ زندگی کی تغیر پذیر حقیقت کے پیش نظر اسے وسعت دینا بھی جانتا ہو۔سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

> ''ان کے نزدیک ہر فن کا مقصد زندگی کی تاریکیوں میں نور بھرنا اور انھیں زیادہ حسین بنانا ہے۔فرد اور معاشرے کو پستی سے بلندی کی طرف لے جانا،اسے حیات ابدی کا

سوز بخشنا، اسے انقلاب کی لذتوں سے آشنا کرنا اور ہر آن ایک نئے دور کی جستجو میں
آوارہ رکھنا اس کا کام ہے۔'' (اقبال شاعری اور فلسفی، صفحہ 131)

اقبال فن کار سے خلوص اور بے لوث جذبہ کا تقاضا کرتے ہیں۔ وہ مسجد قوت الاسلام، اہرام مصر اور مسجد قرطبہ کے مدح خوان محض اس لیے ہیں کہ یہ حسین اور پر شکوہ عمارتیں، زندگی کی ابدیت اور اس کی رفعت وشوکت اور اس کے جلال و جمال کی مظہر ہیں، اس لیے وہ انھیں ''خونِ جگر'' کا معجزہ قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے تصورِ فن کی تفہیم کے لیے ''خونِ جگر'' کی اصطلاح کلیدی اہمیت اختیار کر گئی، جو ایک طرف تو تخلیق کار کی جگر کاوی اور دل دوزی کی مظہر ہے، دوسرے اپنے نقطہ نظر اور تصورِ حیات پر اخلاص اور ایقان کی نقیب ہے۔

اقبال اور آزادی فکر و عمل:

سید وقار عظیم کا یہ غیر روایتی مقالہ 12 صفحات پر مشتمل ہے، سید وقار عظیم کے نزدیک انسان کو فکر و عمل کی آزادی تاریخِ انسانی میں کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ کبھی دوسرے انسانوں نے مشکلات پیدا کیں، کبھی خود انسان نے اپنے لیے مشکلات کا سامان کیا۔ اسی لیے اقبال نے اجتہاد کا درس دیا اور پر جوش انداز میں کہا کہ ''زمانہ با تو نسازد تو بہ زمانہ ستیز، چناں چہ جب اقبال انسان کو فطرت کی قید میں دیکھتے ہیں تو اس پر بھی نکتہ چینی کرتے ہیں، اور کبھی خدا سے دعا کرتے ہیں۔ یہی عمل، خودی کو مستحکم کرنے کا ذریعہ ہے، لیکن اس آزادیٔ عمل کے لیے بعض قواعد و ضوابط کی ضرورت ہوتی ہے۔ بقول سید وقار عظیم:

''اقبال انسان کو عمل کی آزادی دے کر بھی اس کے لیے صرف اس عمل کی راہیں کھولتے ہیں جو صالح ہے اور جو قوانین الہیہ ہونے کی بنا پر صرف اچھے نتیجے پیدا کرتا ہے۔'' (اقبال شاعر اور فلسفی، صفحہ 154)

اقبال کی نظموں کا لہجہ:

15 صفحات پر مشتمل سید وقار عظیم کے اس مقالے میں سید وقار عظیم نے اقبال کے شاعرانہ اسلوب پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اقبال چوں کہ فلسفی شاعر ہیں، اس لیے ان کا شاعرانہ لہجہ تو حکیمانہ ہے، لیکن جذبے کے گداز، احساس کی شدت اور پیغام کے تقاضوں نے اقبال کے لہجے کو بار ہا متاثر کیا

ہے۔جس کی وجہ سے ان کی شعری کائنات میں ایسا تنوع پیدا ہوا ہے جو کسی شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا۔ وقار صاحب نے اقبال کی پانچ طویل نظموں ''شکوہ''، ''والدہ مرحومہ کی یاد میں''، ''شمع اور شاعر''، ''خضر راہ'' اور ''طلوعِ اسلام'' کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔

اپنے قیامِ یورپ میں (1905 تا 1908) اقبال نے مسلمانوں کے استحصال کا مشاہدہ جس باریک بینی سے کیا اسی نے ان میں بے تکلفی، بے ساختگی، روانی، تغزل، شوخی جیسی خصوصیات کی حامل نظم ''شکوہ'' تحریر کروائی ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' میں اقبال کی شخصیت دو حیثیتوں سے جلوہ گر ہوئی، ایک فلسفی شاعر کی دوسری عام انسان کی جو ماں کو یاد کر کے آنسو بہاتا ہے۔

''شمع اور شاعر''، اور ''طلوعِ اسلام'' میں اقبال اُمتِ مسلمہ کے ترجمان بھی ہیں اور شاعرِ دل نواز بھی۔ان نظموں میں تاریخ سیاست اور فلسفے کے علاوہ مسلمانوں کی اجتماعی اور اخلاقی زندگی کے کئی اہم پہلوؤں کی طرف اشارے کیے ہیں۔ان اشاروں کا انداز اور لہجہ ہر جگہ حکیمانہ ہے۔دونوں نظموں میں ان کا لہجہ نشاط و اُمید کا حامل اور روشن مستقبل کا رجائی پیامی ہے۔

سید وقار عظیم کے نزدیک اقبال نے جن ادوار میں یہ نظمیں تحریر کیں ان میں سیاسی اور معاشرتی احوال نے ان کی طبیعت پر مخصوص اثرات مرتب کیے۔

ان خیالات و تصورات کی نوعیت مختلف ہے۔لہجے کا فرق ان نظموں میں زیادہ ہے جہاں وہ حکیم الامت کی حیثیت سے ظاہر ہوئے ہیں۔ایسی نظموں میں اقبال نے زندگی کے مسائل کو قرآن کی روشنی میں دیکھا اور جذباتی انداز اختیار کرنے کی بجائے اپنے فکر سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

> ''اقبال کی ساری مشہور نظموں میں لہجے کا یہ فرق بدیہی طور پر موجود ہے اور اس نے نظموں کے مجموعی انداز کو بھی متاثر کیا ہے۔'' (اقبال شاعر اور فلسفی، صفحہ 129)

اقبال کی اُردو غزل:

> ''17 صفحات پر مشتمل سید وقار عظیم کے اس مقالے میں اقبال کی نظموں کی لازوال شہرت کے تناظر میں اس حقیقت پر توجہ دی گئی ہے کہ اقبال کی غزل ایک تو اب مرزا داغ کے اثرات سے نکل چکی تھی، دوسرے خود اقبال نے ''بالِ جبریل'' کے لیے

کہی جانے والی بے مثال غزلوں کی تکمیل اپنے آخری دور میں کی تھی ،تیسرے اقبال نے غزل کے موضوعات کو آفاقی و کائناتی اور لہجے کو جلال سے ہم آہنگ کیا تھا اور ساتھ ہی اس کی لفظیات کو بھی معنوی توسیع دی تھی ،سو اس مضمون میں سید وقار عظیم نے یہ بات باور کرائی ہے کہ اقبال کی غزل ارتقائی انداز کی حامل ہے اور ان کی غزل کو مواد، موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے ۔''بانگِ درا'' کی غزلیں روایتی انداز کی حامل ہیں ۔وقار عظیم صاحب کے بقول ان غزلوں میں تصوف، اخلاق اور دنیائے حسن وعشق کے ویسے ہی مضامین ہیں جیسے ہر عام غزل گو شاعر کے ہوتے ہیں،اس دور میں داغ کا رنگ نمایاں ہے ۔فارسی اسلوبِ ادا کا گہرا نقش موجود ہے ۔سید وقار عظیم کے نزدیک اِن غزلوں میں تصنع اور آورد کا سایہ ہے ۔جذبہ اور احساس میں وہ ہم آہنگی بھی نہیں، جو بعد کے دور کے اقبال کی غزل کا وصف ٹھہرا۔ دوسرا دور قیام یورپ کا دور ہے ۔یہاں اقبال شاعری کو کارِ بیکار کہہ کر شعر گوئی ترک کرنے کی طرف مائل ہیں ۔گو کہ اس دور کی غزل میں پندو وعظ موجود ہے اور اسی دور کی غزل میں ان مخصوص خیالات کی ترویج اور تبلیغ کا رنگ جھلکنا شروع ہوا جن سے آگے چل کر اقبال کے فلسفہ حیات کی تشکیل اور تعبیر ہوئی ۔وقار عظیم صاحب کے بقول

''اقبال کی اس دور کی غزل مجموعی حیثیت سے تقلید رسوم سے آزاد ہونے کی ایک کوشش ہے ۔اقبال کے لہجے میں بھرپور اعتماد ہے ۔''(اقبال شاعر اور فلسفی ،صفحہ 181)

اقبال کی غزل کا تیسرا دور نئے موضوعات اور انقلاب آمیز نظریات کی وجہ سے انتہائی انفرادیت کا دور ہے ۔سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

''یہ (وہ) غزلیں ہیں جن کی بدولت غزل کی روایت ایک نئی آواز ،نئے آہنگ اور نئے لہجے سے آشنا ہوئی ......ان غزلوں میں ایک ایسا واضح انقلابی رجحان ہے جس نے غزل سے اس کے روایتی موضوع چھین کر اسے نئے نئے فلسفیانہ موضوع دیے اور ان موضوعات کی بدولت زندگی کے ایک نئے فلسفے کی بنیاد رکھی گئی ۔''(اقبال شاعر اور فلسفی ،صفحہ 183)

سید وقار عظیم اقبال کی غزل کا فنی وفکری جائزہ مجموعی طور پر لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''اقبال کی غزل لفظی اور معنوی لحاظ سے بھی بھرپور انداز کی حامل ہے ۔اقبال اگرچہ

فلسفی ہیں تاہم ان کی شاعرانہ اپج ،ان کے فلسفیانہ رنگ سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے ۔اسی لیے ان کی غزل میں تغزل کی بھرپور کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔یہ تغزل اسی صورت میں نظر آتا ہے جب شاعر روایتی انداز کو اپنے ساتھ رکھتا ہے ۔سید وقار عظیم کے نزدیک ''بال جبریل'' کی غزلوں میں فن اور موضوع کا حسین امتزاج موجود ہے ۔یہ غزلیں ،زبان وبیان اور فنی تخلیق کا حسین اور دل کش آہنگ رکھتی ہیں ۔''
(اقبال شاعر اور فلسفی ،صفحہ 189)

اقبال کی نظموں میں رنگِ تغزل:

49 صفحات پر مشتمل سید وقار عظیم کا طویل ترین مقالہ رسالہ ''اقبال'' لاہور اپریل 1953 میں چھپا تھا، مقالہ کا آغاز نہایت دل نشیں انداز میں ہوا ہے ۔اقبال کی نظموں میں حکیمانہ وفلسفیانہ آہنگ پایا جاتا ہے ۔فلسفے کی خشکی شاعرانہ تغزل کو ماند نہیں پڑنے دیتی ۔تغزل کی تعریف کرتے ہوئے سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

''تغزل، خیال ،جذبے ،احساس یا تجربے اور اسلوب کی ان ساری خصوصیات کی ،جو غزل کی روایت کا جزوِ خاص ہیں، رچی ہوئی صورت اور کیفیت ہے ۔''(اقبال شاعر اور فلسفی ،صفحہ 197)

تغزل کسی شاعر میں محنت اور ریاضت کے بعد پیدا ہوتا ہے ۔سید وقار عظیم کے نزدیک ''بانگ درا'' کی ابتدائی نظموں میں تغزل کا گزر نہیں کیونکہ:

''اقبال کی حالت ......ایک بھٹکے ہوئے راہی کی سی ہے ،جس کے دل میں کسی نہ کسی منزل تک پہنچنے کی طلب اور آرزو تو ہے لیکن وہ اس چیز سے بے خبر ہے کہ آخر وہ کون سی منزل ہے جس پر پہنچ کر اس کی طلب آسودہ ہوگی اور جہاں اس کے خواب کی آرزو کی تعبیر پوری ہوگی ۔''(اقبال شاعر اور فلسفی ،صفحہ 198)

اس دور میں اقبال کا تغزل بکھرے ہوئے اجزا کی طرح منتشر نظر آتا ہے ۔ابھی شاعری میں آورد ہے آمد نہیں ابھی ایک جستجو سی ہے اور ابھی شوقِ منزل سے نا آشنا ہے ۔سید وقار عظیم کے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ بات تو غزل کی ہے لیکن ابھی ان میں غزل کا انداز نہیں ہے ۔

وقار صاحب ''تصویر درد'' کی مثال دیتے ہیں جہاں ان کے نزدیک نظم میں بات محبت کی ہے درد کی ہے لیکن لفظوں میں وہ تڑپ نہیں احساس نہیں، تغزل کا گزر نہیں کیونکہ شاعر ابھی اس واردات سے نا آشنا ہے۔ اسی طرح ''انسان اور بزم قدرت'' میں انداز واعظانہ ہے تا ہم اس میں تغزل کا رنگ عیاں ہے۔ وقار صاحب اسی بات کے پیشِ نظر اپنے مخصوص مہذب لہجے میں کہہ دیتے ہیں کہ ان کی بعض نظموں میں اکثر ایسے شعر آجاتے ہیں جو روایتی تغزل سے بھرپور ہوتے ہیں، تاہم ان میں اسلوب ادا اور طرز اظہار کی کمی، فنی حیثیت کو کم کر دیتی ہے۔ (اقبال شاعر اور فلسفی، صفحہ 209)

اقبال کی پسندیدہ بحریں:

سید وقار عظیم کا یہ بارہواں مقالہ صرف 9 صفحات پر مشتمل ہے۔ کلام اقبال میں جو شاعرانہ حسن اور غنائیت پائی جاتی ہے۔ اس کا بڑا سبب بحور کا حسنِ انتخاب بھی ہے۔ اقبال نے مختلف بحروں کا استعمال مختلف مواقع پر کیا، مگر نہایت احتیاط سے۔ اقبال نے تخیلاتی انداز کی حامل نظموں میں بھی بحر کی غنائی کیفیت کا خاص خیال رکھا ہے۔ اگرچہ ان میں غنائیت کے باوجود ٹھہراؤ ہے تا ہم اس ٹھہراؤ میں بھی خاص بہاؤ ہے۔ سید وقار عظیم نے نہایت مفصل انداز میں اقبال کی اختیار کردہ بحور پر تکنیکی بحث کی ہے۔ ''بانگ درا'' اور ''بال جبریل'' کی زیادہ تر نظمیں بحر رمل محذوف میں ہیں۔ سید وقار عظیم اقبال کی پسندیدہ بحور کی خصوصیات تحریر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

> ''بحر کے ارکان کی ترتیب میں توازن اور اس خوشگوار توازن سے پیدا ہونے والی نغمگی کے علاوہ روانی اور خوش آہنگی کی کیفیت ان کی پسندیدہ بحروں کی مشترک خصوصیتیں ہیں۔'' (اقبال شاعر اور فلسفی، صفحہ 249)

اقبال نے بال جبریل کی نظموں غزلوں میں مقبول بحروں کا استعمال کیا ہے تا ہم بانگ درا میں اس کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے۔ وقار صاحب کے نزدیک ''بانگ درا'' کی بنیادی لیکن جذباتی نظموں میں حد درجہ معروف اور مقبول بحروں کا استعمال اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اقبال کے شاعرانہ مزاج نے جہاں انھیں، بات کہنے کے لیے وہ شاعرانہ اسلوب اختیار کرنے پر مائل کیا ہے جو ہماری شاعری کی روایت کا روحِ رواں ہے وہاں بحر کے انتخاب میں بھی اپنے ہم عصروں اور نوجوانوں کی رہنمائی کی ہے۔

اقبال کا مردِ مومن:

17 صفحات پر سید وقار عظیم کا یہ مقالہ درسی تنقید کا مقبول موضوع رہا ہے۔اقبال نے دراصل جس مثالی معاشرے کا تصور پیش کیا۔اس میں اعلیٰ انسانی خصوصیات کا حامل مردِ مومن بھی شامل ہے۔یہ مردِ مومن اپنی خودی کے مقام سے آشنا ہے۔یہ مردِ مومن،غنا اور فقر کا حامل ہے۔عقل وعشق کی کشمکش میں ہمیشہ عشق کی راہ اختیار کرتا ہے۔وقار عظیم صاحب اس بات کی یوں وضاحت کرتے ہیں:

''اقبال نے اپنی شاعری میں ایسے مردِ مومن کا تصور پیش کیا ہے جو رزمِ حق وباطل میں فولاد کی طرح سخت اور حلقہ یاراں میں ابریشم کی طرح نرم ہے وہ جلال وجمال دونوں کا آئینہ بھی ہے اور ارباب ذوق کا ساقی اور میدان شوق کا فارس بھی۔''(اقبال شاعر اور فلسفی،صفحہ 268)

اقبال نے یہ تصور قرآن سے اخذ کیا اور اس کی لیے اصطلاحیں استعمال کیں۔مثلاً بندہ،مومن، مردِ حق آگاہ،مردِ خدا اور مردِ خدا آگاہ وغیرہ تاہم مردِ مومن کی اصطلاح قرآن سے اخذ کی گئی ہے۔سید وقار عظیم اس کی وجہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک اسلام ایک ایسا دین ہے جو اپنی تعلیمات کی بدولت مادیت کو روحانیت کی طرف لا سکتا ہے۔یہ دین فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔اس پر عمل کرنے والے ہی مومن کہلا سکتے ہیں۔اقبال کا مردِ مومن فطری صلاحیتوں سے کام لے کر ایک مثالی معاشرے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرنا چاہتا ہے۔وقار صاحب کے بقول مردِ مومن کے ذریعے اقبال نے آج کے انسان کو یہ پیغام دیا ہے کہ ماضی کا انسان اپنے اعلیٰ وارفع مقام پر پہنچ چکا ہے جہاں زندگی نے اسے جبریل واسرافیل کے صیاد کی حیثیت سے دیکھا ہے۔عہدِ حاضر کے انسان کو اپنی جملہ صلاحیتوں کو کام میں لا کر انسانی زندگی کی معراج پر پہنچنا چاہیے مگر یہاں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس معراج تک صرف مردِ مومن ہی پہنچ سکتا ہے۔

اقبال کی شاعری کا ایک کردار:

13 صفحات پر مشتمل اس مقالے میں اقبال کے ایک معتوب کردار ''ملا'' کا ذکر ہے۔سید صاحب کے نزدیک اقبال کی انفرادیت یہ ہے انھوں نے روایتی علامتوں،استعاروں اور شعری کرداروں کو نیا روپ بخشا ہے۔انھی کرداروں میں سے ایک کردار ''ملا'' کا ہے۔اقبال اس ملا کے مخالف ہیں کہ جو

مذہب وشریعت کا محض ڈھونگ رچاتا ہے،انسان کو گوشہ نشینی کی تعلیم دے کر اس کے اوصاف حمیدہ کو گم گشتہ کرنا چاہتا ہے ۔اس کے برعکس اقبال ایسے درویش کے حامی ہیں، جو مذہب اسلام کی راہوں کو اختیار کرتے ہوئے عمل، جدوجہداور سعی پیہم کا پیغام دیتا ہے ۔اس کردار (درویش) کے لیے اقبال نے کئی تراکیب اور تمثیلیں استعمال کیں ۔مثلاً رند،صوفی،پیرِ مغاں وغیرہ۔اقبال نے اپنی ابتدائی شاعری میں تو مُلا پر طعن وتشنیع بھی کی ہے تاہم ''بال جبریل''اور''ضرب کلیم''میں طنز نہیں بلکہ رفعت اور بلندی کا حامل بھرپور لہجہ ہے ۔وقار صاحب کے نزدیک تین چیزوں نے انسان کو گمراہی میں مبتلا کر کے اسے انسانیت کے درجے سے گرایا ہے وہ تین چیزیں ہیں ۔

1۔ یونانی فلسفہ
2۔ ویدانت کی تعلیم
3۔ صوفیوں کا مسلک

(اقبال شاعر اور فلسفی،صفحہ 285) سید وقار عظیم کے خیال میں اقبال مُلا اور اس کی مُلائیت کے سارے طلسم کو اس لیے توڑنا اور اس کے راز کو اس لیے فاش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے محدود اور جامد ذہن کی بدولت انسان کو اپنے مقصد حیات سے ہٹا دیتا ہے،حالاں کہ اس کٹھن منزل کا زادسفر''عمل توشہ''ہے اور مُلا کو فطرتاً اس توشے سے کوئی تعلق اور مناسبت نہیں ۔(اقبال شاعر اور فلسفی،صفحہ 290)

اقبال کی نظمیں اور عظمت آدم:

10 صفحات پر مشتمل یہ مقالہ پہلی بار اخبار''امروز''لاہور میں یوم پاکستان کے موقع پر شائع ہوا۔ عظمتِ آدم کا بیان اقبال کی شاعری کا اہم ترین موضوع ہے ۔اسی عظمت کو اُجاگر کرنے کی لیے مصنف ایک مرتبہ خود پھر خودشناسی کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہیں ۔اس کے لیے اُنھوں نے بال جبریل کی نظموں''فرشتے جنت سے آدم کو رخصت کرتے ہیں''''روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے''کو موضوع بنایا ہے ۔وقار صاحب کے نزدیک یہ نظمیں اقبال کے شاعرانہ اور تعمیر پسند مزاج کی خوبصورت شکل ہیں ۔یہ نظمیں حکیمانہ انداز رکھتی ہیں ۔

اقبال نے انسان میں بیداری،خودداری اور عزت نفس کا احساس پیدا کیا اور وہی جنت سے نکلا ہوا انسان اب اپنے نفس کو اس قدر پہچان چکا ہے اور اپنی خودی کو اس قدر آشکار کر چکا ہے کہ وہ اپنی ایک نئی

دنیا آباد کرتا ہے، نیا جہان تخلیق کرتا ہے۔ وہ اپنے خونِ جگر پر بھروسہ کرتا ہے اور بخشی ہوئی جنت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وقار عظیم لکھتے ہیں:

''اقبال نے انسان کے دل میں اس کی بلندی و رفعت اور عزت و عظمت کا احساس پیدا کرنے کی لیے، اسے اپنی نظر میں معزز و محترم بنانے کی لیے فکر کا نظام قائم کیا ہے۔ ان کی پوری شاعری ان کے اس عظیم نصب العین کی تفسیر ہے اور اس شاعری کے مختلف اجزا اس روحانی تفسیر کے دل نشین نکات۔'' (اقبال شاعر اور فلسفی، صفحہ 304)

اقبال کی نظم۔ تسخیرِ فطرت:

11 صفحات پر مشتمل یہ مقالہ اقبال کے پسندیدہ موضوع ''عظمتِ آدم'' کے بارے میں ہے۔ اقبال نے اس سلسلے میں قرآنی آیات کا سہارا لیا۔ آدم کی تخلیق اور اس کے حوالے سے کائنات میں جو تبدیلی ہوئی، اقبال نے اس کو منظوم کیا ہے۔ سید وقار عظیم نے اسے ایک منظوم ڈرامہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے اقبال کے فلسفیانہ ادراک اور پرثروت تخیل کو خراج تحسین پیش کیا ہے کہ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر قرآنی آیات کی مدد سے ایک دل کش ڈرامہ تخلیق کیا ہے جس میں کردار نگاری، مکالمہ نگاری اور منظر نگاری اپنے عروج پر ہے۔ (اقبال شاعر اور فلسفی، صفحہ 308)

''آدم کے جس افسانے کو ابلیس کے الفاظ میں اس کے (ابلیس کے) لہو سے رنگینی ملی تھی۔ اسے اقبال کی تصوریت نے ایک نقطے پر لا کر ختم کیا ہے جہاں انسان کی فضیلت اور عظمت کے نقش میں ثبات و دوام کا رنگ درخشاں ہے۔'' (اقبال شاعر اور فلسفی، صفحہ 317)

اقبال کا ایک مرثیہ:

8 صفحات پر مشتمل یہ کتاب کا آخری مقالہ ہے جسے سید وقار عظیم نے 1955 میں تحریر کیا تھا، تاہم یہ کسی رسالے میں شائع نہ ہوا تھا، 1968 میں آپ نے اس پر نظر ثانی کی اور اس کتاب میں شامل کر لیا۔ وقار صاحب اقبال کے دل کو محبت اور عقیدت کا سرچشمہ اور سوز و دردمندی کا خزینہ قرار دیتے ہیں۔ تاریخ کی دیگر شخصیات کی طرح اقبال نے بھی زندگی کی مشکلات کو خود پر آسان کیا اور عقیدت سے سر

جھکایا ہے۔تاہم اس عقیدت میں کیف وکم کی کمی نظر آتی ہے۔سید وقار عظیم کے خیال میں:

''والدہ مرحومہ کی یاد میں، اُردو میں اقبال کی شاید واحد نظم ہے، جس میں وہ پڑھنے والے کو فکر اور جذبہ دونوں کے دام میں اسیر کرتے ہیں یہاں اقبال دل کی دُنیا کا ترجمان ہے اور فکر اور جذبے کی کشمکش میں جذبے کو بالآخر فتح حاصل ہوتی ہے اور ایک خوبصورت منظوم پیکر ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے۔ (اقبال شاعر اور فلسفی، صفحہ 324) نظم میں جہاں جذبے کا ذکر ہے سادہ، آسان اور مانوس تشبیہیں ہمیں ملتی ہیں۔اختتام تک پہنچتے پہنچتے فکر اور جذبے کی کشمکش ختم ہو کر ایک خوبصورت امتزاج، تال میل یا ہم آہنگی کی صورت اختیار کر لیتی ہے، تاہم نظم کے آخری بند میں ایکا ایکی جذبہ فکر کی بندشوں سے آزاد ہو کر دل کی باتیں کہنے لگتا ہے۔یوں نظم فکر اور جذبے کی کشاکش کی خوبصورت تصویر ہے۔

''اقبال شاعر اور فلسفی'' فلسفہ اقبال پر اور فن اقبال پر ایک اہم کتاب ہے۔سید وقار عظیم نے اقبال کو ایک حکیم، دانا، فلسفی، مفکر، مصلح اور معلم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم اور بلند پایہ شاعر یا فن کار قرار دیا ہے۔جو تمام شاعرانہ اسرار و رموز سے واقف ہے، جو فن کو نہایت ماہرانہ چابکدستی سے اپنے فلسفیانہ موضوعات کی لیے استعمال کرتا ہے۔وقار صاحب نے اقبال کے فکری اور فنی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے اقبال کی شاعری کو فکری اور فنی لحاظ سے ایک عام قاری تک پہنچانے کے لیے یہ کتاب اساسی حیثیت رکھتی ہے۔زیر بحث کتاب میں چند موضوعات ایسے ہیں جن پر پہلی بار قلم اُٹھایا گیا ہے اور عام مروجہ مضامین وموضوعات سے ہٹ کر بات کی گئی۔مثلاً اقبال کی فکر کو ان کی شاعری کے مماثل قرار نہیں دیا جاتا بلکہ ان کو بعض لوگ فلسفی کہتے ہیں اور بعض شاعر۔وقار صاحب نے اقبال کے فلسفہ و شاعری کو ایک دوسرے کا ہم سر قرار دیا ہے۔

☆ اقبال معاصرین کی نظر میں:

علامہ اقبال سے سید وقار عظیم کو جو خاص ذہنی اور قلبی وابستگی تھی اسی نے انھیں اقبالیات پر لکھے گئے اِن مضامین کو ایک کتابی صورت میں مرتب کرنے کی طرف مائل کیا۔اس کتاب کو مرتب کرنے کی ذمہ داری سید وقار عظیم نے اپنے دوست شیخ محمد اکرام کے ایمائے خاص پر قبول کی تھی اور اسے مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کرنے کا فیصلہ بھی کر دیا تھا، اپنے ایک انٹرویو(یکم اپریل 1973 رفیع الدین ہاشمی سے گفتگو) میں اس کتاب کے تالیفی سفر کے متعلق کہتے ہیں:

”مجلس ترقی ادب (لاہور) نے ایک کام میرے سپرد کیا ہوا ہے اور وہ یہ کہ اقبال کی زندگی میں ان کی شخصیت اور فکر وفن پر جو مضامین شائع ہوئے، ان کا ایک اچھا سا انتخاب مرتب کردوں، اس کے ساتھ مقدمہ ہو اور حواشی بھی۔ میں ایسے مضامین کی تلاش کر رہا ہوں اور خاصا کام ہو چکا ہے۔“ (معین الرحمٰن سید ڈاکٹر، جہان اقبال، صفحہ 127)

دو برس کی تلاش وجستجو کے بعد 21 مقالات پر مشتمل یہ کتاب دسمبر 1973 میں منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب 543 صفحات پر مشتمل ہے جب کہ اس کا سائز 8/22x18 ہے۔ زیر نظر کتاب کے مقالات کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اقبال کی زندگی میں لکھے گئے اور خود ان کی نظر سے گزرے۔ بعض مضامین پر اقبال نے خود اپنی رائے بھی دی۔ ان مقالات کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔ (اقبالیات کا مطالعہ، صفحہ 26)

1 ”اقبال ایک پیغمبر کی حیثیت سے“، از ممتاز حسن رسالہ ہمایوں، لاہور، اکتوبر 1931

2 اقبال اور سیاست عالیہ، سید زبیر، رسالہ ”نیرنگ خیال“ لاہور، ستمبر، اکتوبر 1932

3 پیام اقبال، قاضی عبد الغفار، رسالہ ”نیرنگ خیال“ لاہور، ستمبر، اکتوبر 1932

4 اقبال پر ایک محققانہ نظر اور ان کی نفسیاتی تشریح، راغب احسن، رسالہ ”نیرنگ خیال“ لاہور، ستمبر، اکتوبر 1932

5 اقبال پر قیام یورپ کا اثر، ممتاز حسن، رسالہ ”نیرنگ خیال“ لاہور، ستمبر، اکتوبر 1932

6 اقبال اور سیاسیات، ڈاکٹر سید عبداللہ۔ رسالہ ”ہمایوں“ لاہور مئی، 1932

7 پیام اقبال، رشید احمد صدیقی، رسالہ ”سہیل“ علی گڑھ، جنوری، اپریل 1932

8 علامہ اقبال اور فلسفہ تصوف، ادیب۔ الہ آبادی، رسالہ ”نیرنگ خیال“ لاہور، ستمبر، اکتوبر 1932

9 فلسفہ اقبال، اکرام الحق سلیم، رسالہ ”نیرنگ خیال“ لاہور، ستمبر، اکتوبر 1932

10 متفاول اقبال، غلام احمد پرویز، رسالہ ”نیرنگ خیال“ لاہور، ستمبر، اکتوبر 1932

11 علامہ اقبال کی شاعری، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، رسالہ ”نیرنگ خیال“ لاہور، ستمبر، اکتوبر 1932

12 اقبال کی شاعری، ڈاکٹر ملک راج آنند، رسالہ ”نیرنگ خیال“ لاہور، ستمبر، اکتوبر 1932

13 کلام اقبال کی ادبی خوبیاں محمد اکبر خان، رسالہ ”نیرنگ خیال“ لاہور، ستمبر، اکتوبر 1932

14 ڈاکٹر اقبال کی اُردو،محمد محمود زمان خان، رسالہ ''معارف'' اعظم گڑھ، 1938

15 مثنوی ''اسرارِ خودی''، اسلم جیراج پوری رسالہ ''الناظر'' لکھنو فروری 1919

16 ''رموزِ بے خودی'' سید سلیمان ندوی، رسالہ ''معارف'' اعظم گڑھ، اپریل 1981

17 ''رموزِ بے خودی'' شیخ عبدالقادر، رسالہ ''مخزن'' لاہور، ستمبر 1981

18 اقبال کی مثنویاں، شیخ محمد اکرام، ڈاکٹر عبدالرحمان، بجنوری (مترجم) رسالہ ''ہمایوں'' نومبر 1930

19 پیامِ مشرق، اسلم جیراج پوری، مشمولہ ''نوادرات'' نوشتہ 1924

20 جاوید نامہ، اسلم جیراج پوری، مشمولہ ''نوادرات'' نوشتہ 1924

21 ضربِ کلیم، اسلم جیراج پوری، مشمولہ ''نوادرات'' نوشتہ 1924

زیرِ نظر کتاب میں 9 مقالات ایک ہی مجلّہ ''نیرنگ خیال'' 1932 سے اخذ کیے گئے ہیں۔ رسالہ ''ہمایوں'' سے 3، ''نوادرات'' سے 3، ''معارف'' سے 2 جب کہ ''مخزن'' اور ''الناظر'' سے ایک ایک مقالہ منتخب کیا گیا ہے۔

کتاب کے آغاز میں سید وقار عظیم نے چودہ صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ تحریر کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں وقار صاحب نے ستر صفحات پر محیط حواشی بھی تحریر کیے ہیں، جو اپنی جگہ خود ایک جامع کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کتاب کا اشاریہ ڈاکٹر سید معین الرحمن نے ترتیب دیا جو 36 صفحات پر مشتمل ہے۔ حواشی و مقدمہ کی اہمیت کے متعلق سید وقار عظیم ایک انٹرویو (یکم اپریل 1973 رفیع الدین ہاشمی سے گفتگو) میں کہتے ہیں:

''حواشی اور مقدمہ اس غرض سے لکھا۔۔۔کہ اقبال کی شخصیت اور شاعری کے متعلق بعض باتوں اور اعتراضات کی وضاحت کی جائے مثلاً اقبال کو سر کا خطاب ملا تو اس کی حمایت اور مخالفت میں کئی مضمون لکھے گئے۔ حواشی میں ان کی وضاحت (کی)۔۔۔ جو اقبال کے متعلق بہت سی باتوں کو سمجھنے میں مدد دیں گی۔'' (اقبالیات کا مطالعہ، صفحہ 311)

زیرِ نظر کتاب کے مضامین عصرِ اقبال میں، شخصیت اقبال پر لکھی جانے والی تاریخی تحریروں کا انتخاب ہے۔ وقار صاحب کتاب کے مقدمے میں اس کتاب کی افادیت و اہمیت اور اقبال کی شاعری پر کی جانے والی تنقید و توصیف کے متعلق لکھتے ہیں:

''ان مضامین میں سے اکثر اقبال کے مطالعے میں آئے اور ان میں سے بعض کے متعلق انھوں نے اپنے خیالات ظاہر بھی کیے۔ تحسین وتشکر کی صورت میں اور کبھی تردید وتوضیح کے انداز میں۔ اقبال نے دوسروں کی کہی ہوئی باتوں کی تردید اور توضیح میں جو مضامین اور خط لکھے وہ ان کے فکر وفن کے طالب علم کی لیے ایک پیش بہا خزانہ ہیں۔'' (اقبال معاصرین کی نظر میں، صفحہ 11)

سید وقار عظیم کے نزدیک اقبال کے دور میں ان کے فکروفن پر جو تجزیاتی تنقید کی گئی ہے اس سے اقبال کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ وقار عظیم صاحب نے بھی ایسے مضامین کا انتخاب کیا جن سے اقبال کی شاعری اور شخصیت کو سمجھنے میں بھرپور مدد ملتی ہے۔ بقول وقار عظیم ان مضامین سے اقبال کی شخصیت کا ایک خاص رُخ ہمارے سامنے آیا جو بعد میں تحقیق اور تدقیق کا موضوع بنایا گیا ہے۔ (اقبال معاصرین کی نظر میں، صفحہ 12) اقبال نے ان مضامین کا جواب اپنے خطبات، خطوط اور مضامین میں دیا۔ وقار صاحب نے ان مضامین کا موثر جواب خطبات کو قرار دیا ہے۔ (اقبال معاصرین کی نظر میں، صفحہ 11)

اقبال کی زندگی میں ان کے کلام کو ادوار کے حوالے سے پرکھا جانے لگا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی مثال سر عبدالقادر کا مقدمہ بانگ درا ہے جسے اقبالیات کے سلسلے کی اہم تحریروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جو 1924 میں شائع ہوا۔ سر عبدالقادر نے نہایت صراحت کے ساتھ اقبال کے کام کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ (اقبال معاصرین کی نظر میں، صفحہ 13)

اس سلسلے میں قاضی عبدالغفار کا مضمون ''پیامِ اقبال'' اور ملک راج آنند کا ''اقبال کی شاعری'' خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ قاضی عبدالغفار نے اقبال کی شاعری کے ہر دور کو ایک ہی فلسفہ حیات کا حامل بتاتے ہوئے ابتدا، ارتقا اور انتہا میں تقسیم کرتے ہوئے بقول سید وقار عظیم یہ فرق محسوس کیا ہے کہ ابتدائی دور میں خیالات میں وسعت تو ہے مگر گہرائی کم ہے۔ دوسرے دور میں فارسی زبان میں اقبال کے خیالات نے پناہ ڈھونڈی۔ گویا قاضی صاحب کے نزدیک پہلا دور بے چینی اور جھجک کا دور ہے اور دوسرا عمل کی منزل کا۔ قاضی عبدالغفار نے اقبال کی شاعری کو صرف دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وطنیت کا، دوسرا ملت پسندی۔

ملک راج آنند نے اقبال کے ابتدائی دور کو رنگین اور دلآویز قرار دیا، کیونکہ اس میں متحدہ قومیت کا راگ الاپا گیا۔ دوسرا دور ان کے قیام یورپ کا ہے۔ جہاں ان کے دل پر محبت کی حکمرانی ہے۔ مداحین اقبال

کے نزدیک یہ بات بڑی طمانیت کی ہے کہ اقبال کے دل میں رفتہ رفتہ عشق مجازی کی چنگاری عشق الٰہی میں بدل جاتی ہے اور یوں تیسرے دور میں مشرق کی لیے ایک نئی صبح کے طلوع ہونے کا پیغام ملتا ہے۔ آنند کے نزدیک یہ تیسرا دور فلسفیانہ خیالات کا دور ہے۔ جس کا مخاطب سارا عالم ہے۔ اقبال کے دوسرے دور کے متعلق وقار عظیم لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں اقبال کی طبیعت میں ایک خاص قسم کی رقت ہے، اکثر نظموں میں ایک سوز ہے، جو کسی میٹھے راگ کی لے کی طرح دل میں بس جاتا ہے ...... یورپ کی دل فریب دنیا ایک پُر بہار گلستان کی مانند تھی، جہاں سے اقبال ایک جوئے نغمہ خواں ہو کر گزرا مگر جب زندگی کے کوہ و بیاباں اس کی نظروں کے سامنے آئے تو وہ ایک سیل تُند رو بن گیا اور ایک دنیا کو اپنے طوفان محشر خیز میں بہا کر لے گیا۔'' (اقبال معاصرین کی نظر میں، صفحہ 16)

زیر نظر کتاب میں وقار صاحب نے جن مضامین کا انتخاب کیا ہے ان میں ان خاص موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔

1۔ پیغمبرانہ و ساحرانہ شاعری
2۔ کلام اقبال کے ادوار
3۔ کلام اقبال کی اساس اسلامی تعلیمات
4۔ اقبال اور سیاست عالیہ
5۔ پیام اقبال
6۔ کلام اقبال کی نفسیاتی تشریح

اقبال کی شاعری کو پیغمبری پیغام کہنے کا رجحان ان کی زندگی میں ہی عام ہو چکا تھا۔ وقار عظیم صاحب لکھتے ہیں کہ:

''زیر بحث کتاب میں بعض مضامین ایسے ہیں جن کے عنوانات ہی سے اقبال کی پیغمبرانہ شان و عظمت عیاں ہوتی ہے تاہم بعض مضامین ایسے بھی ہیں جن میں بظاہر پیغمبری کو عنوان نہیں بنایا گیا تاہم ان میں بھی پس پردہ الہامی عناصر کا بیان موجود ہے۔'' (اقبال معاصرین کی نظر میں، صفحہ 17)

وقار صاحب کے نزدیک مضمون نگاروں نے اقبال کی شاعری کی پیغمبرانہ شان ہونے کا نظریہ ''اسرار ورموز'' سے لیا ہے۔بعض نقادوں نے محض اس کے مطالب تک اپنے خیالات کو محدود رکھا اور بعض نے اپنے دلائل مضبوط کرنے کی لیے''اسرار ورموز'' کے ساتھ ساتھ ''بانگ درا''،''پیام مشرق'اور ''زبور عجم'' کی مثالیں بھی دی ہیں وقار صاحب کے نزدیک اقبال کی شاعری کو پیغمبرانہ شاعری کہنے کی جو روش چل نکلی ہے اس کی وجہ اقبال کا وہ فکری نظام ہے کہ جس کی بنیاد نظام اسلام پر ہے اور اس کی لیے ضروری ہے کہ قاری اسلام کی تعلیمات سے آگاہ ہو، کیوں کہ اقبال کے یہاں اسلام بہت وسیع معنوں میں آتا ہے۔وقار صاحب نے نہایت باریک بینی سے تجزیاتی بنیادوں پر تمام مضامین پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور مضمون نگاروں کی اس روش کو تنقید کی نظر سے دیکھا ہے کہ اقبال کے کلام کو ہر حال میں پیغمبرانہ کہنا لازمی ہے، خواہ موضوع کچھ اور ہی ہو۔اقبال کی فکر کے تانے بانے کو ہر صورت میں اسلامی تعلیمات سے منسلک کر دیا جاتا ہے اور بقول وقار عظیم یہ اقبال کی خوبی ہے کہ انھوں نے عہد کی ضرورتوں اور تقاضوں کے تحت ایک منظم اور مربوط فلسفیانہ نظام تشکیل دیا ہے۔(اقبال معاصرین کی نظر میں، صفحہ 21)

ناقدین اقبال ان کے کلام کو ہر پہلو سے دیکھتے ہیں کہیں ان کے کلام کو ان کی شخصیت کا آئینہ قرار دے کر شخصیت ہی کو اتنی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کہ پسندیدگی ،مبالغہ آرائی میں بدل جاتی ہے۔مقالہ نگاروں نے تعریف وتوصیف کے ساتھ ساتھ حسب موقع اختلاف رائے سے بھی کام لیا ہے، تاہم وقار صاحب نے اس بات کو خوش آئند قرار دیا ہے کہ مبالغے کا رنگ بعض مضامین میں تو ہے اکثر میں نہیں۔کہتے ہیں: کہ جن مضامین میں اقبال کی وکالت کی گئی ہے ان میں مناظرے کا رنگ پیدا ہو گیا ہے تاہم یہ صورت ہر ایک میں نہیں اور جن میں ہے وہاں نتائج منطقی استدلال کی بنا پر قائم کیے گئے ہیں، ایسے مضامین میں بیان کی شگفتگی بھی موجود ہے۔اور قوت بھی۔(اقبال معاصرین کی نظر میں، صفحہ 22)

وقار صاحب اس بات کو خوش آئند قرار دیتے ہیں کہ کلام اقبال پر تجزیے اب بین الاقوامی سطح پر بھی ہو رہے ہیں اور اس بات کو تسلیم کیا جا رہا ہے کہ شاعر مشرق کی آواز اب مغرب تک گونج رہی ہے اور یہی کلام اقبال مردہ انسانیت کی لیے حیات نو کا پیغام لائے گا۔

کتاب کے آخر میں وقار عظیم صاحب نے ستر صفحات پر مشتمل حواشی دیے ہیں جو اتنے جامع اور مکمل ہیں کہ بجائے خود ایک کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔مضامین کے مطالعے کے دوران اکثر ایسے مبہم الفاظ آتے ہیں کہ جن کی تفہیم ضروری ہوتی ہے۔سید وقار عظیم نے نہایت محنت وذکاوت سے یہ حواشی تحریر کیے ہیں۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے ان حواشی کو قیمتی قرار دیتے ہوئے انھیں ''بیش بہا خزانہ'' قرار دیا ہے، کہتے ہیں کہ حواشی بجائے خود عین معیار ہیں کہ اقبال اور متعلقات اقبال کی توضیحات کی سطح کیا ہونی چاہیے اور اقبال سے متعلق کتابوں کو کس طرح مرتب کیا جانا چاہیے۔(اقبالیات کا مطالعہ، صفحہ 29)

مختصر یہ کہ سید وقار عظیم نے نہایت محنت و ذکاوت سے یہ حواشی تحریر کیے۔ یہ حواشی وقار صاحب کی علمیت، ان کے گہرے مطالعے اور ناقدانہ تجزیے کی خوبصورت مثال ہیں۔

زیرِ نظر کتاب اقبال شناسی میں نہایت اہم مقام رکھتی ہے۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اس کتاب کے متعلق اپنی رائے کچھ یوں دیتے ہیں: ''اقبال معاصرین کی نظر میں، کے نام سے (وقار عظیم صاحب) کا ترتیب دیا ہوا ایک اچھا مجموعہ بھی چھپا ہے۔''

''ڈاکٹر سید معین الرحمان صاحب کے بقول اس کتاب کو ''مطالعہ اقبال در حیاتِ اقبال'' کہنا چاہیے۔''(شخصیات و ادبیات، صفحہ 71)

زیرِ نظر کتاب کے منظرِ عام پر آنے سے اقبال کے نقادوں کی لیے تنقید کی راہیں متعین ہوئیں اور اس طرز پر دیگر ناقدین نے اقبال پر لکھے گئے مختلف مضامین کو کتابی صورت میں شائع کیا۔

☆ اقبالیات کا مطالعہ:

20 جنوری 1975 کو سینٹرل پروڈکشن، ریڈیو پاکستان لاہور کی لیے ایک ''لائیو انٹرویو'' میں ڈاکٹر سید معین الرحمان کے ایک سوال کے جواب میں کہ ''اقبال شاعر اور فلسفی'' کے بعد اقبال پر آپ کی نئی کتاب کے سامنے آنے کا کیا امکان ہے؟ وقار صاحب نے فرمایا:

''اقبال ......شاعر اور فلسفی'' بھی جیسا کہ آپ نے دیکھا مضامین کا مجموعہ ہے اس کتاب کے چھپنے (1968) کے بعد بھی میں نے اقبال پر دو تین مضمون لکھے اور وہ رسالہ ''اقبال'' میں چھپے۔ یہ خاصے طویل ہیں۔ بعض موضوعات ہیں، جو اب بھی میرے ذہن میں ہیں اور جن کاموں کی تکمیل کا گویا ارادہ رکھتا ہوں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان موضوعات پر میں مضمون لکھوں اور وہ مجھے یقین ہے ضخامت میں اتنے ہو جائیں گے کہ شاید پھر ایک کتاب مرتب ہو جائے۔''(اقبالیات کا مطالعہ، صفحہ 26)

لیکن اقبال پر یہ مضامین لکھنے کی فرصت اور مہلت وقار عظیم صاحب کو میسر نہیں آ سکی۔ پنجاب

یونیورسٹی اورینٹل کالج سے ریٹائرمنٹ کے بعد وقار عظیم صاحب کی مصروفیات کا بیشتر حصہ اقبال سے متعلق تھا۔اس دوران آپ نے اقبال پر جتنے بھی مضامین تحریر کیے،اور جتنے بھی مقالات اورتقریریں کیں،سید معین الرحمان نے ان سب متفرق تحریروں کوجمع کر کے صد سالہ ولادت اقبال اورسید وقار عظیم صاحب کی پہلی برسی 1977 کے موقع پر''اقبالیات کا مطالعہ'' کے نام سے ترتیب دیا۔یہ کتاب اقبال اکیڈمی لاہور سے شائع ہوئی۔جو کہ(364)صفحات پر مشتمل ہے۔ڈاکٹر سید معین الرحمان کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''اقبال پر جن نئے مضامین کا خاکہ وقار عظیم صاحب کے ذہن میں تھا اور جو بالیقین اقبال کے متعلمین کی بہت سی الجھنوں کو رفع کرنے کا باعث ہوتے منصۂ شہود پر نہ آسکے۔یہاں تک کہ 17 نومبر 1976 کو وہ ناگہاں اللہ کو پیارے ہو گئے۔اس عقب میں اب زیرِ نظر کتاب''اقبالیات کا مطالعہ''تلاش وترتیب اورتدوین وطباعت کے مراحل سے گزر کر اہل شوق کے ہاتھوں میں ہے۔''(نقوش۔لاہور،سالنامہ جنوری 1977،صفحہ 610)

ڈاکٹر سید معین الرحمان نے تلاش بسیار کے بعد سید وقار عظیم کی اقبال سے متعلق تحریروں کو زیرِ نظر کتاب میں جمع کر دیا۔ڈاکٹر صاحب مقدمہ میں اس کتاب کو بقول غالب،میوہ چیدہ درسبد،یا بچا کھچا ٹوکری بھر پھل کہا ہے جو فصل ختم ہونے پر درختوں پر رہ جاتا ہے۔

اِس کتاب میں بیشتر وہ چیزیں شامل ہیں جو اقبال پر وقار عظیم صاحب کے پہلے مجموعہ مضامین ''اقبال شاعر اور فلسفی'' کے بعد لکھی گئیں اور ایک آدھ ایسی تحریر بھی ہے جو اگرچہ پہلے کی ہے لیکن پہلے مجموعے میں شامل نہ تھی۔(اقبالیات کا مطالعہ،صفحہ 35)

ڈاکٹر معین الرحمان نے اس کتاب کا 34 صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ تحریر کیا جس میں آپ نے اقبال سے متعلق وقار عظیم صاحب کی ذہنی وفکری وابستگی ،اقبالیات سے متعلق اُن کی دیگر مصروفیات کا احاطہ آپ نے اس میں قلم بند کیا ہے۔آخر میں 19 صفحات پر مشتمل کتاب کا اشاریہ شامل ہے۔

زیر بحث کتاب کا محرک ایک انٹرویو میں وقار عظیم صاحب نے اس طرح بیان کیا۔(رفیع الدین ہاشمی سے یکم اپریل 1973):

''میرے ذہن میں اقبال کے بعض ایسے موضوعات ہیں جن پر کچھ لکھنے کو جی چاہتا

ہے۔میں اس انداز میں لکھنا چاہتا ہوں کہ بات طلبہ کی سمجھ میں بھی آ جائے کیوں کہ اپنے تدریسی تجربے کی بنا پر میرا احساس یہ ہے کہ بعض مقامات ایسے ہیں جہاں اقبال کے طلبہ کو الجھن ہوتی ہے۔میں یہ چاہتا ہوں کہ طلبہ کی ایسی الجھنیں دور کرنے کی لیے کچھ لکھ سکوں۔تو یہ بڑا کام ہوگا مگر ابھی فرصت میسر نہیں آ رہی ،ذرا یکسوئی نصیب ہوتو اس طرح کے کم از کم چار پانچ مضمون لکھوں گا۔''(اقبالیات کا مطالعہ ،صفحہ 30)

ڈاکٹر سید معین الرحمان نے زیر بحث کتاب کو ترتیب دیتے وقت انھی مقالات کو اساس بنایا۔اس کے علاوہ متفرق تقاریر،مضامین اور ریڈیو،ٹی وی کی ریکارڈنگ کو ترتیب دیا۔21 نگارشات اور 364 صفحات پر مشتمل اس کتاب کے چار حصے ہیں:

1۔ مقالات

2۔ جائزے

3۔ متفرقات

4۔ اضافات (ایڈیشن اول)

☆ **مقالات:**

''اقبال اور نشاۃ نو''،سہ ماہی اقبال لاہور اکتوبر 1971

''تلاش عزلت اور احساس تنہائی'' سہ ماہی اقبال،لاہور اپریل 1976

''طلسم گنجینۂ معنی''سہ ماہی،اقبال ریویو کراچی،جولائی 1975

''اقبال اور سوز غم ملت''روزنامہ امروز،لاہور،فروری 1974

''انیس اور اقبال''ماہ نو کراچی،انیس نمبر 1972

''عقل و دل اقبال کی نظر میں''المعارف،لاہور،اپریل 1970

آخری تین مضامین پہلی اشاعت میں اضافات کے طور پر شامل تھے۔

اقبال اور نشاۃ نو:

علامہ اقبال نے اپنا فلسفہ فکر اور پیغام ہر طبقے اور ہر عمر کے فرد تک پہنچایا ہے۔ان میں مرد وزن،

بچے اور نوجوان نسل شامل ہے ۔اقبال نے جہاں کہیں اپنے خیالات کو ایک خاص ذہن تک پہنچانے کی کوشش کی ہے، وہ ذہن ہے ایک نوجوان کا ذہن ۔جسے اقبال نے ایک خاص سیاق میں ''نژادِنو'' کہا ہے ۔(اقبالیات کا مطالعہ،صفحہ 02)

سید وقار عظیم کے نزدیک اقبال کی نظم ''خطاب بہ جوانانِ اسلام'' پہلی نظم ہے جس میں انھوں نے براہِ راست پہلی مرتبہ مسلمان نوجوان کو مخاطب کیا ہے ۔اقبال ماضی کے آئینے میں فردا کی تصویریں اپنے نوجوان کو دکھاتے ہیں کہ ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے ہیں ۔بانگ درا کی دیگر بہت سی نظمیں اسی رنگ کی نشاندہی کرتی ہیں ان نظموں کا رنگ اور لب ولہجہ واعظانہ، خطیبانہ اور مصلحانہ ہونے کے بجائے شاعرانہ اور حکیمانہ ہے ۔وقار صاحب'' پیامِ مشرق''،''جاوید نامہ''،بالِ جبریل اور ارمغان حجاز کی مختلف نظموں کی مثالیں دیتے ہیں ۔ان نظموں میں ''تہذیب حاضر''، ''مسلمان اور تعلیم جدید''،''کفر و اسلام''،''مرید ہندی''، ''پیر رومی''،''جاوید کے نام''،''ایک نوجوان کے نام''،''جاوید''،''ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام''، ''افرنگ زدہ ہندی مکتب اور مدرسہ شامل ہیں ۔وقار عظیم لکھتے ہیں کہ اقبال نے اشاروں، علامتوں اور تلمیحاتی ناموں کے ذریعے ان خیالات و تصورات کے اظہار و ابلاغ میں مدد لی ہے جو ان کے فلسفہ حیات کے تشکیلی اجزا یا عناصر ہیں ۔ان علامتوں اور اشاروں کو اشعار میں اس طرح سمویا ہے کہ وہ دورِ حاضر میں اُردو کے قاری کا وظیفہ بن گئے ہیں ۔وقار صاحب کے نزدیک اقبال کے پیغام نے کلیوں کی صورت اختیار کر لی ہے اور یہ کلیے ہر قدم پر ہمارے دلوں میں ولولہ اور جوش اور روحوں میں بیداری پیدا کر کے اپنے عہد کے تقاضوں کو سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں ۔(اقبالیات کا مطالعہ،صفحہ 20)

وقار صاحب کے نزدیک نوجوانوں سے مخاطب ہوتے وقت اقبال کا انداز بیانیہ ہوتا ہے جس میں جدید تعلیم کے زہریلے اثرات سے بچنے کی تنبیہ کی گئی ہے، ان اشعار کا انداز فلسفیانہ بھی ہے اور حکیمانہ بھی ۔وقار صاحب لکھتے ہیں کہ اللہ نے اقبال کو یہ خاص عطیہ ودیعت کیا تھا کہ وہ حکمت اور فلسفہ کے اسرار کے رمز شناس بھی تھے اور دین کی نزاکتوں اور لطافتوں کے بھی ۔انھوں نے خرد کی بے حضوری کا پردہ فاش کر کے جنوں کو اپنانے کی تلقین بھی کی ۔(اقبالیات کا مطالعہ،صفحہ 23)مختلف نظموں کے مطالعے کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

> ''اقبال کی موجودہ نسل کا انسان، جسے انھوں نے کبھی ''نوجوان'' کہا ہے اور کبھی بہ حیثیت مجموعی ''نژادِنو'' ایسے فکری اور جذباتی رویے کے قید وبند میں پھنسا ہوا دکھائی دیا

کہ انھیں انسان کا مستقبل تاریک اور بھیانک نظر آنے لگا اور انھوں نے شاعر اور مفکر کی حیثیت سے خود پر یہ فرض عائد کیا کہ وہ مستقبل کے مقدر اور مقسوم کی سربراہی اور قیادت کرنیوالے انسان پر ان سب حقیقتوں کا اعتراف کریں جوان کی چشم بینا نے دیکھیں اور قلب مضطر نے محسوس کی ہیں۔'' (اقبالیات کا مطالعہ، صفحہ 27)

سید وقار عظیم کے نزدیک اقبال اپنے اس پیغام سے کسی بھی دور میں غافل نہیں رہے۔ بلکہ ہر لمحہ اس کی طرف متوجہ رہے اور اسے کبھی کسی مصلح کی طرح انجام دیا، کبھی شاعر کی طرح اور کبھی فلسفی کی طرح اور ضرورت اور موقع کی مناسبت سے اپنے لہجے میں کبھی تلخی پیدا کی، کبھی شفقت اور کبھی تدبر۔ سید وقار عظیم کے نزدیک اقبال نے نئی نسل کو جو پیغام دینا چاہا ہے اس کا بہترین اظہار نظم ''جاوید کے نام'' اور '' سخنے بہ نژاد نو'' سے ملتا ہے۔ اقبال نوجوان نسل میں جس جذبہ، تحمل، لگن اور عشق کی تڑپ دیکھنا چاہتے ہیں اس کے متعلق وقار صاحب نے لکھا کہ اقبال کے پاس ایک بے چین اور مضطرب جان ہے، وہ اس اضطراب کو کسی اہل نوجوان کے دل میں منتقل کرنا چاہتے تھے۔ شاید اسی لیے جاوید نامہ کی نظم ''رقص جاں'' تخلیق ہوئی۔ (اقبالیات کا مطالعہ، صفحہ 42)

اپنی نظم درحضور رسالت مآب ﷺ میں اقبال نے مسلم نوجوان کی زبوں حالی کا ذکر بالکل حالی کی التجائیہ نظم کی طرح کیا ہے۔ ''حریم کوئے محمد کو اپنی آرزوؤں کی پناہ گاہ، اس کی نگاہ التفات کو ساز حیات اور اس کی ناخدائی کو اپنی اُمیدوں کی کشتی کا سہارا سمجھنے والے اقبال نے جس تمنا کی بارآوری کے لیے اس بارگاہ لطف وکرم کا رُخ کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے نفس کو پھر وہ سوز اور اس کے نغمے کو پھر وہ گداز ملے جو سوئی ہوئی نئی نسل کو جگائے اور اس عہد کے گم کردہ راہ نوجوان کو منزل کی طرف لانے کے لیے ضروری ہے اس لیے کہ نئی نسل کا یہی فرزند ہے جو خودنگری اور خود آگاہی کے مرحلوں سے گزر کر آسمانوں پر کمند ڈالنے کی خدمت انجام دے گا۔'' (اقبالیات کا مطالعہ، صفحہ 48)

اقبال: تلاش عزلت اور احساس تنہائی:

کتاب کا دوسرا مقالہ اپریل 1976 میں منظر عام پر آیا۔ اس میں وقار صاحب نے اقبال کی مختلف نظموں مثلاً ایک آرزو، صدائے درد، خفتگان خاک سے استفسار اور رخصت بزم جہاں، کی مختلف شعری تمثالوں کے ذریعے اقبال کی فکر اور احساس تنہائی کی وضاحت کی ہے۔ وقار صاحب کے نزدیک

احساس تنہائی کا سب سے خوبصورت اظہار اقبال نے ''ایک آرزو'' میں کیا ہے ۔اس نظم میں اقبال کا مزاج اور افتادِ طبع اقبال کی اس شاعری کے برعکس ہے جس میں مشکلات سے نبرد آزما ہو کر زندگی کندن بنتی ہے ۔وقار صاحب اقبال کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس نظم میں اقبال ایک ایسے افسردہ دل اور غمگین انسان کے روپ میں نظر آتے ہیں، جس کی لیے انجمن سازی اور انجمن آرائی میں ذرا بھی لطف اور کیف باقی نہیں، وہ شورشوں اور ہنگاموں سے بھاگ کر سکون کی آغوش میں پناہ لینے کا خواہش مند ہے ۔(اقبالیات کا مطالعہ، صفحہ 50)

سید وقار عظیم نفسیاتی معالج کے سے انداز میں یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اقبال کی تنہائی کی یہ کسک کیا کسی شکست خوردگی کے احساس کا نتیجہ ہے؟ وقار عظیم صاحب کے خیال میں دراصل شاعر کے ماحول کی گھٹن ہے، جس سے گریزاں ہونے کی خواہش بہت شدت سے موجود ہے وقار صاحب کے نزدیک دیگر مذکورہ نظموں میں بھی اقبال ایک نئی دنیا کا آرزومند دکھائی دیتا ہے، وطن سے محبت اس کے دل میں موجود ہے لیکن وہ فطرت کی آغوش میں نئی دنیا بسانے کا آرزومند ہے، جس کی خوبصورت دلیل ''ایک آرزو'' ہے۔

قیام یورپ کے دوران اقبال کی فکری زندگی میں جو ہیجان انگیز طوفان برپا ہوا ۔اس کے متعلق وقار صاحب لکھتے ہیں کہ اس دور میں بھی فطرت کے ساتھ تعلق قائم ہے ۔اب اس کے غم میں پہلے جیسا اضطراب اور خلش نہیں، بلکہ شاعر کو یہ احساس سکون دے رہا ہے کہ اسے شب غم کی تنہائی میں انجم کی ہم نشینی میسر ہے اور قدرت نے اس کے دل کے ساتھ ہم نفسی کا رشتہ استوار کر لیا ہے ۔یورپ کے سفر میں اقبال نے تہذیبی، معاشرتی، معاشی، علمی اور سیاسی فضا کا ایک نیا مشاہدہ کیا، جس نے ان کے خیالات کی دنیا میں ہلچل مچا دی، اب ان کا جغرافیائی وطنیت کا تصور ماند پڑنے لگا اور عالمگیریت کا تصور پروان چڑھنے لگا۔وقار عظیم لکھتے ہیں کہ یورپ کی مجلسی زندگی کے حسن و جمال نے اقبال کی جذباتی دنیا کو نئے کیف، نئے خمار اور نئی سرخوشی سے دوچار کیا اور احساس کے اضطراب نے اقبال کے جسم و جان پر چھا کر ان میں ایسی ہلچل پیدا کی کہ، ''آہ نیم شبی'' اور ''گریہ سحرگاہی'' ان کا معمول بن گیا ۔(اقبالیات کا مطالعہ، صفحہ 68)

اقبال کو اس دور میں بقول سید وقار عظیم ایک ایسے رفیق و دمساز کی ضرورت ہے، جس کے سامنے دل چیر کر رکھ دیں تا کہ انھیں اس اضطراب کی داد مل سکے ۔غم کی اسی شدت میں دل اپنا رفیق آپ بن

جاتا ہےاورخود کوہمدرد سمجھ کراپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہےاور یوں باتوں باتوں میں ان آرزوؤں کا سراغ ملتا ہے، جن کی تکمیل کا دوسرا نام زندگی ہے۔

اقبال نے ان خیالات کا اظہار اس دور کی نظموں، خصوصاً اسرارخودی کے دعائیہ اشعار میں کیا ہے جن میں بقول سید وقارعظیم اقبال نے خود کو شمع کی طرح جلتا ہوا پیش کیا اور اپنے اشکوں سے گلشن کی آبیاری کر کے اسے گل بداماں بنایا ہے اور ماضی و مستقبل سے نئے رشتے استوار کیے ہیں، بقول وقار صاحب دُعا کا ایک ایک لفظ اس اضطراب کا غماز ہے۔ جس میں اقبال کے جان و روح میں کتنا کرب ہے، وقارعظیم صاحب نے اقبال کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے کہ وہ اس کو لفظوں کے سانچے میں ڈھالنے میں بہت کامیاب ہوئے ہیں اور یوں اضطراب کا پورا نقش بھی ابھر کر سامنے آ گیا اور اضطراب کے اسباب کی نشاندہی بھی ہوگئی۔ (اقبالیات کا مطالعہ، صفحہ 76)

وقارعظیم صاحب کے الفاظ میں اس فریاد میں اتنی شدت تھی کہ بعد میں آنے والی شاعری کے ادوار میں بھی یہ خلش نغموں کی جھنکار بن کران کے شعروں میں جگہ پاتی رہی۔ ''پیامِ مشرق'' کی خیالی جنت کی سیر ہو یا ''بالِ جبریل'' کی غزلیں یا ارمغانِ حجاز کی نظمیں، جدائی، فراق اور ہجر کی کڑیاں منطقی طور پر احساس تنہائی کی کڑیوں سے مربوط ہیں۔ اقبال نے ان محرومیوں اور تنہائیوں سے گھبرا کر عزلت پسندی کی جو روش اختیار کی تھی، اس کا رُخ جذبۂ خدمت گزاری، ذوقِ جستجو اور گرمئی فکر نے نئی سمت میں تبدیل کیا اور ایک نیا سانچہ تیار ہوا، جسے سید وقارعظیم ''یکتائی'' کا نام دیتے ہیں۔ آرزوؤں کی یہ جوت، روح میں شامل ہو کر انسان کے وجود کو ہی نہیں ساری کائنات کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے، تنہائی کے اسی احساس سے اقبال اپنی خودی سے آشکار ہوا اور بالآخر یہی خودی اسے بارگاہ خداوندی میں حاضر ہونے کی جرات عطا کرتی ہے۔ بقول سید وقارعظیم:

> ''زندگی کا جو سفر کسی جبر کی بنا پر خلوت پسندی کی خواہش اور آرزو سے شروع ہوا تھا اسے اب عالم اختیار میں طلب کیا جاتا ہے، اقبال نے یہ سفر خلش، کشمکش اور اضطراب کے نہ جانے کتنے مرحلوں سے گزر کر خودی کے سوز، اس کی قوت اور اس کے اعتماد کی مدد سے اس خلش، کشمکش اور اضطراب کو شکست دے کر کیا ہے اور اسی کا کرشمہ ہے کہ بالآخر اختیار بن کران کے فکر، احساس، جذبے اور تخیل کی دنیاؤں پر محیط نظر آتا ہے۔''
> (اقبالیات کا مطالعہ، صفحہ 97)

طلسم گنجینۂ معنی:

اس مقالے میں وقار عظیم نے فرمایا کہ لفظوں کے انتخاب سے شاعر کی شخصیت کا اندازہ با حسن و خوبی لگایا جا سکتا ہے۔ لفظوں کے ذریعے ہی معانی تک رسائی ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:

> "لفظ، معنی اور ذات کے اس باہمی رشتے کا احساس ہمیں ہر بڑے شاعر کا کلام پڑھتے وقت ہوتا ہے اور مطالعے کی ایک منزل پر پہنچ کر ہمیں اندازہ ہونے لگتا ہے کہ شاعر نے معانی کے ابلاغ کی لیے بیان کا جو پیرایہ اختیار کیا، اس میں بعض خاص لفظوں یا ترکیبوں کا اعادہ بار بار ہوتا ہے اور یہی خاص لفظ اور یہی خاص ترکیبیں ہیں جن سے شاعر کے اسلوب کی اور اس اسلوب کے رشتے سے اس کی شخصیت کی انفرادیت متعین ہوتی ہے۔" (اقبالیات کا مطالعہ، صفحہ 98)

وقار عظیم صاحب کے نزدیک لفظ اور معنی کے رشتے کی یہ نوعیت جس طرح اقبال کی شاعری میں بار بار نمودار ہوتی ہے کسی اور شاعر کے ہاں نہیں ہوتی یہاں تک کہ اقبال کے استعمال کیے گئے حرف "غ" میں ایک نیا صوتی تاثر اور غنائی آہنگ موجود ہے۔ لفظ "فروغ" اقبال کی بیشتر غزلوں اور نظموں میں بطور قافیہ بھی استعمال ہوا ہے اور اشعار کے درمیان بھی، وقار صاحب نے اس لفظ کے مختلف معانی، مختلف لغات (اسٹنگاس، پلاٹس، نوراللغات، فرہنگ آصفیہ، فرہنگ اندراج) کا حوالہ دے کر اپنی بات کی وضاحت کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ اقبال کا فلسفہ بنیادی طور پر اثبات خودی کا فلسفہ ہے جو خود اقبال کے نزدیک نفیِ خودی کے زہر کا تریاق ہے اور یہ فلسفہ انسان کو ذات، عمل جدوجہد کا اور مسلسل اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا سبق دیتا ہے کہ اسی طرح ذات کے جوہر اُبھرتے ہیں اور جہان رنگ وبو کا پوشیدہ حسن بھی نمایاں ہوتا ہے۔ اقبال نے خودی اور کائنات کے جملہ امکانات کے واضح ہونے کا جو نقش اپنے تخیل سے بنایا ہے اس کے اظہار کے لیے "فروغ" کا لفظ استعمال کیا ہے کہ اس لفظ کے ساتھ روشنی، ترقی، عظمت، رفعت، جلال اور جمال کے کتنے تصورات یکجا ہو کر سامنے آتے ہیں۔

اقبال کے کلام میں لفظ (فروغ) کہیں تو روشنی، نور یا جلوے کے معنوں میں اور کہیں رونق اور چہل پہل کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اکثر اشعار میں یہ کیفیت ہے کہ ایک شعر میں لفظ "فروغ" نے جتنے معنی دیے ہیں لغت کے تمام الفاظ مل کر بھی اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ وقار صاحب نے "بال جبریل"، "ضرب کلیم"، "زبور عجم"، "جاوید نامہ"، "ارمغان حجاز"، "پیام مشرق" اور

''اسرارِ خودی'' کے مختلف اشعار کا حوالہ دیا ہے اور ''فروغ'' کے معنی کا احاطہ کیا ہے ۔وقار صاحب کے نزدیک لفظ ''فروغ'' سے روشنی ،نور اور رونق کا مفہوم ملتا ہے تو دوسری طرف یہ ذہن کے انبساط ونشاط کا باعث ہے اور ساتھ ہی ایک خاص جمالیاتی حس سے آشنا کرواتا ہے اور یہ خوبی ہمیں صرف اقبال کے یہاں ملتی ہے ۔وقار عظیم لکھتے ہیں:

''شعرِ اقبال میں دلآویزی اور دل نشینی دوسری بہت سی چیزوں کے علاوہ اس بات سے بھی پیدا ہوئی ہے کہ وہ لفظ کی معنوی اہمیت کے علاوہ اس کی جمالیاتی حیثیت کے رمز شناس ہیں اور لفظ کو شعر میں صرف اس لیے جگہ دیتے ہیں کہ وہ بیک وقت فلسفی کی میراث بھی ہے اور شاعر اور مغنی کی بھی ۔''(اقبالیات کا مطالعہ،صفحہ 109)

عقل ودل اقبال کی نظر میں:

وقار عظیم لکھتے ہیں کہ اقبال کے نظریات میں خودی بنیادی فلسفہ ہے اور یہ خودی عشق سے استوار ہوتی ہے اس عشق کے پیچھے عقل بھی کارفرما ہے ۔سید وقار عظیم مختلف نظموں کا حوالہ دے کر اقبال کے فلسفہ عقل وعشق کو واضح کرتے ہیں،ان نظموں میں عقل وعشق کے درمیان مکالمہ جاری رہتا ہے ساتھ ہی یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی تیسرا کردار سرگرم عمل ہے جو سامع کی حیثیت رکھتا ہے،سید وقار عظیم نے نظم ''عقل ودل'' کی تفسیر وتشریح نہایت عمدہ انداز میں کی ہے اور اس نظم کو اقبال کے عقل وعشق کے فلسفے کا نچوڑ کہا ہے،سہل ممتنع کی حامل یہ نظم ''ساقی نامہ'' کی ابتدائی شکل ہے ۔

انیس اور اقبال:

یہ سید وقار عظیم کا واحد مضمون ہے جس میں انھوں نے اقبال کا موازنہ باقاعدہ طور پر کسی دوسرے شاعر کے ساتھ کیا ہے ۔عام خیال ہے کہ انیس اور اقبال کے خیالات میں بہت فرق ہے لیکن سید وقار عظیم کے نزدیک ان کے درمیان نصب العین کا اشتراک موجود ہے ۔اقبال نے جس مردِ مومن کا تصور پیش کیا ہے اور جس اصلاحی زندگی کا تصور پیش کیا ہے اس کو اقبال نے داستان حرم قرار دیا ہے اور اس کی ابتدا ''اسماعیلؑ'' اور انجام کی علامت ''حسینؑ'' ہیں ۔اقبال کے نزدیک مقامِ شبیری ایک ابدی حقیقت ہے جو فقر اور عشق سے حاصل ہوتا ہے ۔انیس کا سارا کلام اوّل تا آخر صبر وعشقِ حسینؑ پر مبنی

ہے۔اقبال نے جس فقر کوشبیری کا نام دیا ہے انیس بھی اس کو اجاگر کرتے ہیں،یوں دونوں صداقت، عدل، شجاعت، سخاوت، رحم وکرم اور غیرت وخودداری کو انسانی کردار کی بلندی جانتے ہیں ۔دونوں شعرا کے سامنے شاعری کی عظیم روایت موجود تھی۔دونوں نے اپنی خاص روش کے باعث اپنی راہیں منتخب کرلیں۔انیس کے مرثیے اور اقبال کی نظمیں ڈرامائیت کی عمدہ مثال ہیں۔مکالمہ نگاری بھی دونوں کا خاص ہنر ہے۔بحور کا انتخاب بھی مشترک ہے، دونوں کی شاعری تغزل سے بھرپور ہے، قافیہ اور ردیف کا استعمال، غنائیت اور ترنم کی موجودگی صنائع بدائع کا خوبصورت استعمال موجود ہے۔ سیدوقارعظیم نے مختلف شعری مثالوں کے ذریعے انیس اور اقبال کی مماثلت کی وجہ روایت سے استواری کو قرار دیا ہے۔

اقبال اور سوزِغم ملت:

سید وقار عظیم نے اقبال کو اسلام کی ان عظیم ہستیوں میں شامل قرار دیا ہے جنھوں نے اُمت مسلمہ کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا ہے۔مضمون کا آغاز سید وقار عظیم صاحب نے اقبال کے ایک خط سے کیا جو انھوں نے سید سلیمان ندوی کو لکھا جس میں دنیائے اسلام کی زبوں حالی پر اظہار تاسف کیا ہے''بلاد اسلامیہ''، ''گورستان شاہی''،''دام تہذیب''،''پیش کش''،''پیام مشرق''اور''تا تاری کا خواب''میں اقبال نے امت مسلمہ کا نوحہ پیش کیا ہے۔نثر میں بھی اقبال نے اس خیال کو پیش کیا (جغرافیائی حدود اور مسلمان) میں اقبال نے مسلمانوں کی ملی ابتری اور انتشار کے اسباب کا تجزیہ کیا ہے۔سید وقار عظیم نے اقبال کے نظریۂ وطنیت کی نہایت مفصل تشریح کی ہے اور اقبال کے ذہنی ونفسیاتی پہلو کو سامنے رکھا ہے۔اقبال کے نزدیک ہر وطن مسلمان کا گھر ہے۔مسلمان کے لیے جغرافیائی حدود کی قید موت ہے۔اقبال نے اپنے اس خیال کی لیے کبھی سیدھا سادھا انداز اختیار کیا ہے۔کبھی واعظانہ، کبھی فلسفیانہ، کہیں سرگوشی کے انداز میں کہیں سادہ تشبیہات واستعارات کے انداز میں۔سیاست، دین، تاریخ، فلسفہ اور ادب وشعر کی تمام حکمت ودانش کو ایک قالب میں ڈھالا اور ملت اسلامیہ کی شیرازہ بندی کا فریضہ سرانجام دیا، وہ مسلمانوں کے ایک سنہری مستقبل کے خواہشمند ہیں۔

اقبالیات کا مطالعہ کا دوسرا حصہ (جائزے) پر مشتمل ہے۔جس میں سید وقار عظیم صاحب کے لکھے گئے آٹھ مضامین کو شامل کیا گیا۔پہلا مضمون وقار عظیم صاحب کی اقبال پر سب سے قدیم تحریر ہے۔

بقول ڈاکٹر سید معین الرحمٰن یہ مضمون وقار عظیم صاحب نے دہلی ریڈیو سے 1942 میں پڑھا۔اس مضمون میں وقار صاحب نے 1937 سے 1941 تک کے پانچ سالوں میں اقبال پر لکھی گئی کتب کا تجزیہ کیا ہے سید وقار عظیم صاحب نے مضمون میں اقبال کو ان خوش نصیب شخصیات میں سے قرار دیا ہے جن پر ان کی زندگی ہی میں تنقیدی و تعریفی مضامین لکھنے کا آغاز ہو جاتا ہے۔

وقار صاحب نے اپنے اس مضمون یا ریڈیائی تقریر میں 10 کتب کا تجزیہ پیش کیا ہے جو اقبالیات کے ابتدائی پانچ سالوں میں شائع ہوئیں۔''جوہر اقبال''اقبال پر لکھے گئے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔

دوسری کتاب''اقبال''ہے جسے وقار صاحب نے''جوہر اقبال''سے بہتر قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس سے کلام اقبال کے پہلو زیادہ نمایاں ہوئے ہیں اور کتاب میں بھرپور توازن موجود ہے۔وقار عظیم صاحب لکھتے ہیں کہ اقبال پر 38-1937 تک جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان سب کے خیالات اور موضوعات زیر بحث کتاب میں موجود ہیں۔اس کتاب کے پہلے مضمون''اقبال کے تصور خودی''از ڈاکٹر عابد حسین کو وقار صاحب نے اقبال کے فلسفہ خودی کو سمجھنے کی طرف اچھی کوشش قرار دیا ہے۔اس کتاب کا دوسرا اچھا مضمون سید وقار عظیم نے خلیفہ عبدالحکیم کا''رومی نطشے اور اقبال''کو قرار دیا ہے۔جس میں فاضل مضمون نگار کی ذہنی اپج کو بھرپور سراہا گیا ہے۔اس کتاب کا تیسرا اچھا مضمون وقار صاحب نے ڈاکٹر یوسف حسین خان کے مضمون''اقبال اور آرٹ''کو قرار دیا ہے۔وقار صاحب لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر یوسف حسین وہ پہلے ناقد اقبال ہیں جنھوں نے اقبال کے اس پہلو کی طرف نظر کی ہے اور بہت عالمانہ انداز سے آرٹ کا تجزیہ کیا ہے۔

وقار عظیم نے تیسری کتاب''اقبال نامہ''کے متعلق لکھا ہے کہ یہ''شیرازہ''کے اقبال نمبر کی کتابی شکل ہے اس کتاب میں اقبال کے حوال ان کے مختلف دوستوں کی زبانی بتائے گئے ہیں۔

چوتھی کتاب''متاع اقبال''ہے جو اقبال کے تین مضامین کا مجموعہ ہے:

پانچویں کتاب''تعلیماتِ اقبال''از یوسف سلیم چشتی ہے۔سید وقار عظیم کے نزدیک چشتی صاحب نے فلسفہ اقبال سے بالکل انصاف نہیں کیا۔کتاب میں تشنگی باقی ہے۔چھٹی کتاب عبدالرحمان طارق کی''پیام اقبال''ہے یہ کتاب وقار صاحب کے نزدیک ابھی وقیع اور جامع تجزیے کی گنجائش رکھتی ہے۔

''سیرت اقبال''از طاہر فاروقی وقار صاحب کے نزدیک ایک اچھی کوشش ہے،جو حیات و کلام

کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ آٹھویں کتاب ''مقالات یوم اقبال'' ہے جو وقار صاحب کے نزدیک اقبال پر لکھے گئے مقالات کا خوبصورت مجموعہ ہے۔

آخری کتاب ''اقبال' اس کی شاعری اور پیغام، ازمولانا عبدالملک آروی کی کاوش ہے۔ بحیثیت مجموعی سید وقار عظیم کے نزدیک تمام مضامین تفہیم اقبال کی طرف اہم قدم ہیں وہ لکھتے ہیں:

''ان مضامین ...... سے کلام اقبال کی بے پایاں وسعتوں اور اتھاہ گہرائیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہر نظر کو اس گہرے سمندر میں ایک نیا موتی نظر آتا ہے جس کی آب دوسرے موتی سے بڑھ چڑھ کر ہوتی ہے۔'' (اقبالیات کا مطالعہ، صفحہ 128)

''اقبالیات کا مطالعہ'' کا تیسرا حصہ متفرقات پر مشتمل ہے۔ جو سید وقار عظیم کی پانچ دستاویزات پر مشتمل ہے۔ ان میں دو بصری اور تین صوتی فیچرز شامل ہیں۔ سید معین الرحمان کے نزدیک:

''یہ تحریریں اس پر دال ہیں کہ سید وقار عظیم صاحب ریڈیو اور ٹی وی کی مخصوص تکنیکی ضرورتوں کے کیسے صحیح انداز شناس تھے۔'' (اقبالیات کا مطالعہ، صفحہ 41)

وقار صاحب کی ان تحریروں کی فہرست درج ذیل ہے:

1۔ اقبال ......خطوں کی روشنی میں
2۔ خودی: بحرِ بے کنار
3۔ اقبال: حقیقت بیں، حقیقت شناس
4۔ اقبال اور عشق رسول ﷺ
5۔ غزل گو اقبال

اقبال......خطوں کی روشنی میں:

1966 میں ریڈیو پاکستان کے ایک میگزین پروگرام میں سید وقار عظیم مختلف ادبی ہستیوں کے مکاتیب کے متعلق مختصر فیچر سناتے ہیں اور بعد میں طلبہ کے سوالات کے جوابات دیتے۔ اسی سلسلے کی کڑی میں اقبال کے خطوط پر آپ نے مذکورہ بالا فیچر پڑھا، جو سالنامہ 'اوراق' لاہور میں جنوری 1967 میں شائع بھی ہوا۔ سید وقار عظیم لکھتے ہیں کہ خطوط شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ یہ مکتوب الیہ کے عہد کی بھی جیتی جاگتی تصویر ہوتے ہیں۔ جس طرح غالب، سرسید، نذیر احمد، شبلی اور اکبر کے خطوط اپنے عہد کے

ترجمان ہیں اس طرح مکاتیب اقبال بھی اپنے زمانے کا عکس ہیں، لیکن زیادہ پر مغز ہیں اس بارے میں وقار صاحب لکھتے ہیں:

''ان کے مکاتیب میں معانی کی بے شمار سطحیں ہیں۔ان خطوں کے مطالب کا مدوجزر ایک بحرِ پایاں کا مدوجزر ہے۔''(اقبالیات کا مطالعہ، صفحہ 206)

جس طرح اقبال کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں اسی طرح خطوں میں بھی تنوع ہے۔ان خطوں میں فلسفہ ہے، سیاست ہے، اخلاق ہے، ذاتی جذبات واحساسات کا بیان بھی ملتا ہے۔ وقار عظیم صاحب اس مختصر تحریر میں اقبال کے خطوط کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اقبال کے خط اپنے عہد کی سیاسی، دینی، معاشرتی، فکری اور ذہنی کیفیت کی دستاویز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انسان، زمین پر رہنے والے انسان کے شب وروز کے معمولات کی سرگذشت اور روداد بھی ہیں۔''(اقبالیات کا مطالعہ، صفحہ 608)

خودی، بحرِ بے کنار:

سید وقار عظیم کا یہ ریڈیائی فیچر 23 اپریل 1974 کو نشر ہوا۔یہ تحریر غیر مطبوعہ ہے، اقبال نے اپنے تصورِ خودی کو بحرِ بیکراں قرار دیا ہے جس کا کوئی کنارا نہیں۔وقار صاحب نے ساقی نامہ کے اشعار کا حوالہ دے کر خودی کے تصور کی وضاحت کی ہے۔خودی کا سفر تخلیق آدم سے شروع ہوا اور نیابت الٰہی اس کی منزل کی جانب قدم ہے، خودی کا سفر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔وقار صاحب نے خودی کو ''صیاد'' قرار دیا ہے کہ جو ماضی اور حال کو شکار کر کے مستقبل کی جانب گامزن ہے۔لکھتے ہیں:

''خودی کے صیاد کو تو اس آہو کا شکار کرنا ہے جو عالم میں نہیں آیا۔جو سبزہ ابھی زیرِ زمین ہے، اس کے چمن کی زینت اور جو گل ابھی پردۂ شاخ میں مستور ہے، اس کی دستارِ فضیلت بنے گا۔بشرطیکہ خودی خوف و مایوسی کی بجائے لاتقنطوا اور لاتحزنوا کو اپنا شریکِ سفر بنائے اور اپنے بحرِ نا پیدا کنار میں تلاطم برپا رکھے۔''(اقبالیات کا مطالعہ، صفحہ 215)

زیرِ بحث تحریر اپنے اختصار کے باوجود انتہائی جامع ہے، جس میں خودی کے سفر کا احاطہ نہایت دل کش انداز میں کیا گیا ہے۔

اقبال: حقیقت بیں حقیقت شناس:

وقار عظیم صاحب کا یہ فیچر بھی ریڈیو پر نشر ہوا اور غیر مطبوعہ ہے۔ اس فیچر میں لفظوں کے اتار چڑھاؤ، لہجے کا انداز، تکنیکی پیچیدگیوں کے پیش نظر صوتی تاثر کا خوبصورت آہنگ ملتا ہے۔ وقار عظیم صاحب نے اقبال کو مفکر، مصلح، حقیقت بیں، حقیقت شناس، بصیرت اور بصارت کا حامل قرار دیا۔ جو ملت کی زندگی پر حقیقت پسندانہ نظر ڈالتا ہے۔ وقار عظیم لکھتے ہیں:

> اقبال کی شاعری شروع سے آخر تک جنس محبت کے اس خریدار، صنم خانہ اسرار کے اس دانائے راز، اس محنت کش و کم آزار انسان کی داستان ہے جس کی رضا راکب تقدیر جہاں ہے اور اقبال کی انسان شناسی اسے درد دیتی ہے کہ:
>
> خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
> خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
>
> (اقبالیات کا مطالعہ، صفحہ 225)

اقبال اور عشق رسول ﷺ:

سید وقار عظیم کا یہ فیچر 26 مارچ 1975 کو پی ٹی وی لاہور سے نشر ہوا۔ جسے وقار صاحب نے یکم مارچ 1975 کو تحریر کیا تھا۔ اقبال کو نبی کریم ﷺ کی ذات سے جو والہانہ عشق ہے اس کا آغاز ان کے ابتدائی دور سے ہوا اور آخری مجموعہ کلام تک اُردو اور فارسی کے ہر مجموعے میں نظر آتا ہے۔ وقار عظیم صاحب نے نظم "بلال"، "مسجد قرطبہ"، "ذوق وشوق"، "اسرار خودی" کے مختلف اشعار سے ایک جاندار تاثر پیدا کیا ہے وقار عظیم لکھتے ہیں:

> "اقبال نے ......عشق رسول ﷺ کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے وہ سرتاپا حکمت وفلسفہ ہونے کے علاوہ ہمہ شوق اور ہمہ جذب ومستی ہے۔" (اقبالیات کا مطالعہ، صفحہ 230)

غزل گو اقبال:

اس موضوع سے متعلق پہلا فیچر 12 نومبر 1975 کو ٹی وی لاہور سے قومی نشریاتی رابطے پر نشر ہوا۔ سید وقار عظیم نے اقبال کی غزل کے ارتقا پر نظر ڈالی ہے اور ساتھ ہی ان موضوعات کا حوالہ دیا جن

کے بیان سے تخلیق آدم۔شرف انسانی اور کائنات میں اس کے مقاصد ومناصب کی داستان مرتب ہوتی ہے۔اس موقع پر اقبال کی غزلوں کو موسیقی کی دُھن پر بھی پیش کیا گیا۔

اسی موضوع پر دوسری تحریر 29، 28 اکتوبر 1976 کو سامنے آئی ۔جسے پی ٹی وی لاہور نے 9 نومبر 1976 کو قومی نشریاتی رابطے پر نشر کیا۔اس تحریر کو دو مختلف راویوں کی آواز میں پیش کیا گیا۔اس تحریر میں بھی سید وقار عظیم نے اقبال کی غزل کو حکیمانہ قرار دیا۔اقبال کی غزل،خودی،عشق اور خود آگاہی کے نظریات سے لبریز ہے۔روایتی علامات اور استعارات کو نئے مفاہیم کا ایسا خوبصورت رنگ دیا کہ غزل جدت سے ہم کنار ہوئی وقار عظیم لکھتے ہیں کہ:

> ''وہی لفظ'وہی علامات'وہی استعارہ اور وہی رمزیت جس نے غزل کو اُردو کی سب سے مقبول صنف بنایا، جب اقبال کے ہاتھ میں آئی تو ان میں سے ہر ایک کو نیا مفہوم ملا۔یہ سیدھی سادی چیزیں زندگی کے اس فلسفے کی ترجمان ہیں جو انسان کی عظمت، فضیلت اور برتری کا فلسفہ ہے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بہترین اقدار کی پیروی اور فروغ کا فلسفہ ہے۔اس فلسفے کو اقبال نے غزل کے سارے حسن و جمال اور دلآویزی کے ساتھ پیش کیا ہے جس کا خواب غالب اور حالی نے دیکھا تھا۔''
>
> (اقبالیات کا مطالعہ،صفحہ 243)

اقبال کی شخصیت اور شاعری پر ایک نظر (تقریر):

یہ تقریر 11 فروری 1975 کو سید وقار عظیم نے پروفیسر حمید احمد خان کی کتاب (اقبال شخصیت اور شاعری) کی تعارفی تقریب کے موقع پر کی۔جس میں وقار عظیم صاحب نے حمید احمد خان صاحب کی کتاب کو بنیاد بنا کر اقبال کی شخصیت اور اُن کی شاعری کا بہت خوبصورت احاطہ کیا ہے۔

شذرات بہ متعلق اقبال:

کتاب کے آخر میں ''شذرات'' کے عنوان سے،اقبال کی شخصیت اور شاعری پر وقار عظیم صاحب کی تحریروں سے وہ تراشے دیے گئے ہیں جو اقبال سے قطع نظر ان کی دوسری ادبی تحریروں اور تنقیدی مقالات کا حصہ بنے۔گو کہ ان کی حیثیت کسی باقاعدہ تحریر کی نہیں لیکن ان پر وقار عظیم صاحب کی مانوس

خوش بیانی اور منطقی خوش استدلالی کی مخصوص چھاپ ہر جگہ نظر آتی ہے۔

بحیثیت مجموعی ''اقبالیات کا مطالعہ'' سید وقار عظیم کی نگارشات پر مشتمل ایک ایسا مجموعہ ہے۔جس سے اقبال کے مختلف پہلوؤں پر سید وقار عظیم کے تنقیدی افکار کی عکاسی ہوتی ہے۔اُنھوں نے جو کچھ بھی لکھا طالب علموں کے نقطۂ نظر سے اُسے زیادہ بامعنی اور مفید بنایا۔

> ''اقبالیات کے ضمن میں سید وقار عظیم نے تنقید اور تدریس ہر دو شعبوں میں ناقابلِ فراموش خدمات سرانجام دی ہیں۔ایک ایسے دور میں جب اقبال کے خلاف ردِعمل ہماری ادبی دنیا کا سکہ رائج الوقت تھا،سید صاحب نے اقبال کے فکر وفن کی حقیقی تفسیر و تعبیر پیش کی ہے۔اِس کے ساتھ ہی ساتھ اُنھوں نے تدریسِ اقبال کا حق ادا کرتے ہوئے ہماری نئی نسلوں کے قلوب اور اذہان کو فکرِ اقبال سے منور کر دیا ہے۔یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔(فتح محمد ملک، پدرم سلطان بود،صفحہ 305)

☆☆☆☆

باب پنجم:

سید وقار عظیم بحیثیت مترجم

وقار عظیم صاحب نے بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد اُردو میں ایم اے کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس وقت اُن کے والد مقبول عظیم صاحب اپنی ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ ایم۔ اے اُردو کی کلاسیں الہ آباد یونیورسٹی میں ہوتی تھیں اس لیے وہاں جانا مقصود تھا۔ وقار عظیم صاحب جانتے تھے کہ ریٹائر منٹ کے بعد والدِ محترم کی آمدنی بہت محدود تھی اِس لیے بیٹے کی پڑھائی کے اخراجات اُٹھانا اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔ لیکن یہ ہر صورت مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس حوالے سے ایک انٹرویو میں اُنھوں نے بتایا:

''1933 میں ایم۔ اے (اُردو) میں داخلے کے لیے لکھنؤ سے الہ آباد یونیورسٹی آنا پڑا کیوں کہ اس زمانے میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم۔ اے (اُردو) کی کلاسیں شروع نہ ہوئیں تھیں۔ میرا الہ آباد جانا بھی ایک عجیب واقعہ ہے۔ والد صاحب ملازمت سے ریٹائر ہو کر کانپور جا چکے تھے۔ اُن کی تنخواہ سے گھر کے اخراجات ہی بہ مشکل پورے ہوتے تھے' ان حالات میں کچھ پس انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ اب سوال پیدا ہوتا تھا کہ اگر میں ایم۔ اے میں داخل ہو گیا تو میرے اخراجات کون برداشت کرے گا۔ میں نے والد صاحب سے کہا کہ اس کی آپ فکر نہ کریں اِس سلسلے سے میں خود ہی نمٹ لوں گا۔ مجھے الہ آباد جانے کی فقط اجازت چاہیے اور آپ کی دعا۔ بادل نخواستہ والد صاحب رضامند ہو گئے اور جب میں گھر سے رخصت ہوا تو اُنھوں نے مجھے پچاس روپے دیے۔ یہی پچاس روپے لے کر میں الہ آباد آ گیا۔

ایک دن روزگار کی تلاش میں نکلا اور سیدھا رام نرائن لال ناشر کی دوکان پر گیا۔ رام نرائن وفات پا چکے تھے اور اب اُن کا بیٹا للو بابو دوکان پر بیٹھتا تھا۔ اُس نے مجھے ایف۔ اے کے نصاب کی فارسی کتاب دی اور کہا کہ اس کا خلاصہ انگریزی میں تیار کر دوں کیوں کہ ان دنوں فارسی کے پرچے کا جواب انگریزی میں دیا جاتا تھا۔ میں نمونے کے طور پر شروع کے آٹھ صفحے ترجمہ کر کے اُس کے پاس لے گیا۔ اُس نے یہ ترجمہ الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر اعجاز حسین کو دکھایا جو اُنھیں بے حد پسند آیا۔ تب للو بابو سے

مجھے باقاعدہ کام ملنے لگا اور اس طرح گزر اوقات ہونے لگی۔'' (پدرم سلطان بود، صفحہ 38) یوں تعلیم مکمل ہونے سے پہلے ہی ترجمے کے کام سے اُن کا تعلق قائم ہوگیا۔ ترجمے سے اُن کا یہ تعلق زندگی بھر رہا۔ کتابیں ترجمہ کیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے اُردو میں اصطلاحات سازی کے دفتر کے نگراں رہے جس کا کام اُردو میں نئی اصطلاحات وضع کرنا اور انگریزی میں مستعمل اصطلاحات کا ترجمہ کرنا تھا۔ ملک میں اُردو کو سرکاری زبان بنانے سے پہلے دفتری اصطلاحات کے ترجمے کا کام جن اصحاب کے ذمہ لگایا گیا اُن میں بھی سید صاحب شامل تھے بلکہ اپنی زندگی کی آخری مصروفیت بھی یہی تھی کہ وہ پنجاب اسمبلی میں وضع اصطلاحات کی میٹنگ میں شرکت کرتے ہوئے ہسپتال گئے تھے۔ اِس کمیٹی میں اُن کے شریک کار ڈاکٹر سید عبداللہ اور صوفی تبسم صاحب بھی تھے۔ اِس بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے بیان کیا ہے:

''پروفیسر سید وقار عظیم مجلسی اور تعلیمی سرگرمیوں میں نہایت انہماک سے حصہ لینے والے شخص تھے۔ آخری کام جو اُنھوں نے کیا وہ مجلس زبان دفتری کی لغات کی ترتیب کا کام تھا جو میں کہہ سکتا ہوں کہ صرف اُنھوں نے کیا اگرچہ ہم چار پانچ لوگ اور بھی اس کے رکن تھے۔'' (پدرم سلطان بود، صفحہ 83)

صوفی صاحب کا بیان ہے پروفیسر صاحب اپنا کام بڑی لگن اور تندہی سے کرتے تھے۔ بعض کاموں میں مجھے اُن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اُن میں سے دفتری زبان کا کام بھی تھا۔ پروفیسر صاحب اپنا کام بڑی لگن اور تندہی سے کرتے تھے۔ اس میں ایک خاص طرح کا لگاؤ اور چاؤ اور انہماک ہوتا تھا اور میں اس سے بہت متاثر ہوتا تھا۔ (پدرم سلطان بود صفحہ 78)

اصطلاحات سازی کے سلسلے میں اُن کی نگرانی میں پنجاب یونیورسٹی نے طبیعات' اقتصادیات' نفسیات' فلسفہ' اور بعض دوسرے مضامین میں جو کام کیا اسے بھی تحسین کی نظر سے دیکھا گیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس حوالے سے ایک جگہ لکھا ہے: ''کئی سال سے اُردو اصطلاحات پر کام کر رہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ کام نہ صرف مکمل ہوگیا بلکہ چھپ کر بھی سامنے آگیا۔ میں اِس کام کو وقار عظیم کا ایک عظیم کارنامہ سمجھتا ہوں۔ (پدرم سلطان بود صفحہ 93)

وقار صاحب نے جن کتابوں کے ترجمے کیے اُن میں ادبی' سیاسی' تاریخی' سوانحی' تنقیدی' نفسیاتی سبھی موضوعات پر مشتمل کتابیں ہیں۔

یہ زیادہ تر تراجم وہ ہیں جو کسی نہ کسی معاشی ضرورت کے تحت کیے گئے جیسا کہ اُنھوں نے خود بھی

ایک جگہ ذکر کیا ہے: ''جامعہ ملیہ سے تصنیف وتالیف کا اِس قدر کام مل جاتا تھا کہ مہینہ بخوبی گزر جاتا تھا ...... جامعہ ملیہ میں دوطرح کے کام ہوتے تھے ایک تو اچھی کتابوں کے ترجمے اور دوسرے درسی کتابوں کی تیاری۔ میں نے دونوں میں مدد دی۔ مثال کے طور پر گاندھی جی کی سوانح عمری 'تلاش حق'' کے کچھ حصے میرے ترجمہ کیے ہوئے ہیں۔ اِسی طرح جوہر لال نہرو کی آٹوبائیو گرافی اور ایچ جی ویلز کی Glimpses of the Word History کے بعض حصوں کا ترجمہ میں نے کیا ہے۔ ترجمہ کا کام جس مجلس کے سپرد تھا اُس کے سارے کام پر آخری نظر ڈاکٹر عابد حسین ڈالتے تھے۔ اُنھوں نے میرا کیا ہوا ترجمہ دیکھا تو اتنا پسند آیا کہ اُنھوں نے مینیجر مکتبہ حامد علی خاں سے فرمایا کہ ان سے زیادہ کام لیا جائے۔ جامعہ جتنے تراجم کراتا تھا اُن پر نام کسی کا نہ ہوتا تھا، بس جامعہ کا نام لکھا جاتا تھا۔ (پدرم سلطان بود صفحہ 46,4)

اچھے ترجمے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک نئی زبان میں ڈھلنے کے باوجود اپنی اصل روح کو قائم رکھے۔ یہ محض الفاظ کی ایک نئی ترتیب کا نام نہیں ہے۔ اس میں اصل کی نغمگی اور موسیقیت شامل ہو تبھی اِس میں خوبصورتی پیدا ہوتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارے یہاں ترجمے کا لفظ بہت محدود معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کیوں کہ اپنے خیالات اور تجربات کو تحریری شکل دینا بھی دراصل ترجمہ ہے۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمے کی بڑی کامیابی یہ ہے کہ مترجم ان باتوں کو بالکل صحیح اور واضح طور پر دوسری زبان میں منتقل کرے جیسی کہ وہ اصل یا حقیقی Original زبان میں کہی گئی ہیں۔

اِن سب باتوں اور شرائط پر پورا اُترنے کے لیے ضروری ہے کہ مترجم کی گرفت دونوں زبانوں پر یکساں اور مضبوط ہونے کے علاوہ اُس کی نظر موضوع پر بھی بھرپور ہو۔

وقار عظیم صاحب ترجمے کی ان مقتضیات سے بخوبی آگاہ تھے اُنھوں نے ترجمہ کرنے سے پہلے اُن موضوعات پر بھی گہری نظر ڈالی تھی جو بحیثیت مترجم اُن کے پیش نظر تھے۔ چناں چہ اُن کے کیے ہوئے ترجموں میں زبان وبیان دونوں کو موضوع کی مناسبت سے استعمال کیا گیا ہے۔

اُن کے کیے ہوئے مشہور تراجم میں سے ایک واشنگٹن ارونگ کی کتاب The Alhamra ہے جو قصصِ الحمرا کے نام سے پہلے پہل 1963 میں شائع ہوئی۔

اِس کتاب کے تعارف میں وقار صاحب لکھتے ہیں:

''اروِنگ کے مزاج اور مذاق کی خصوصیت یہ ہے کہ اُس کے لیے ہر اُس چیز میں کشش ہے جو قدیم ہے اور جس پر رومان کی رنگینی اور سحر کا سایہ ہے۔ اُس کی رومان پسندی اور رنگینیٔ تخیل نے تاریخی اور سیرت کی صداقتوں میں جو رنگ آمیزی کی ہے اُس نے اُس کی کاوشوں میں جا بجا افسانے کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔'' (قصصِ الحمرا صفحہ 12)

ترجمہ کرتے وقت وقار عظیم صاحب نے بہت عمدگی سے ارونگ کے مزاج' اُس کے تخیلات اور اس کے اُسلوب کی خوبصورتی کو اُردو میں منتقل کیا ہے۔ خود اس بارے میں کہتے ہیں: ''ترجمہ کرتے وقت میں نے کوشش کی ہے کہ اِس طلسم کی تاثیر باقی رہے جو الحمرا کی داستانوں کے مصنف نے باندھا ہے۔'' (قصصِ الحمرا پیش لفظ)

اب ذرا کچھ تراجم ملاحظہ فرمایئے:

''لوگوں کی دو قسمیں ہیں جن کے لیے زندگی ایک مسلسل تفریح اور تماشا ہے۔ جو بہت غریب ہیں اور جو بہت امیر ہیں۔ ایک کے لیے یوں کہ اُنھیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں اور دوسرے کے لیے یوں کہ اُن کے پاس کچھ کرنے کو نہیں۔''

''الحمرا محبت کرنے والوں کی بہشت ہے۔ اِس بہشت میں تنہا رہنا کتنا بڑا ستم ہے۔''

''مرمریں فرش کے بیچ میں سنگِ موسیٰ کا فوارہ تھا' جس کے گرد خوشبودار پھولوں کی خوبصورت جھاڑیاں تھیں۔ فوارے میں سے پانی کا ایک جھرنا پھوٹتا تھا جس سے پوری عمارت میں خوشگوار خنکی پیدا ہو جاتی تھی اور فضا میں ہر طرف ایک خواب اور موسیقی بکھر جاتی تھی۔''

''بڑھاپے کا عشق مشورے اور انجام دونوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔''

''محبت کرنے والوں کی راہ میں سنگِ گراں حائل ہوں تو حُسن کی کشش زیادہ بڑھتی اور آتشِ شوق زیادہ بھڑکتی ہے۔ محبت کا پھول کانٹوں میں اُلجھ کر زیادہ شگفتہ اور آتشِ فراق میں تپ کر زیادہ رنگین ہوتا ہے۔''

تخلیقی اور افسانوی ادب کے معاملے میں وقار عظیم صاحب کے ترجمے میں اُسلوب بیان کی خوبصورتی اور الفاظ کے موزوں انتخاب نے ترجمے کو ایک طبع زاد تحریر کی شکل دے دی ہے۔

دوسری طرف جب وہ کسی تنقیدی' تاریخی یا بچوں سے متعلق کتاب کا ترجمہ کرتے ہیں تو اپنے پیش نظر کچھ دوسری باتیں رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے بچوں کے لیے بھی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا جن میں

مطالعے کے طریقے، بچوں کی جماعتی زندگی، بچوں کو بہتر بولنا سکھایئے، دوست بنانا اور دوستی نبھانا، مدرسے کی زندگی میں بچے کی رہنمائی وغیرہ شامل ہیں۔

یہ کتابیں امریکہ کے مختلف اساتذہ، تعلیمی اور نفسیاتی ماہرین نے اپنے علم، تجربے اور تحقیق کی بنا پر لکھیں تاکہ یہ بچوں کی شخصیت اور میلانات کو سمجھ کر مقصد کے حصول میں اساتذہ اور والدین کی صحیح رہنمائی کرسکیں۔

موضوعات کی اہمیت کے پیشِ نظر ان کتابوں کا ترجمہ کرتے ہوئے وقار عظیم صاحب نے جن باتوں کا خیال رکھا اُن کے بارے میں لکھتے ہیں: ''مترجم کی حیثیت سے مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ میں نے مطالب کو جابجا اپنے ماحول میں ڈھالتے وقت یہ بات پیشِ نظر رکھی ہے کہ اصل کی روح میں فرق نہ آنے پائے اور جو بات مصنف نے کہی ہے وہ آسان سے آسان زبان میں ادا ہو جائے۔'' (مطالعے کے بہتر طریقے۔گذارشات)

اِس بات کو سمجھنے کے لیے ترجمے کا ایک اقتباس:

> ''پڑھنے کی اہمیت محض کاروباری نہیں شخصی اور معاشرتی بھی ہے بچوں کے لیے بھی اور بڑوں کے لیے بھی۔شہریت اور اچھی شہری زندگی کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں اسے کس حد تک جانتے اور سمجھتے ہیں۔یہ جاننا اور سمجھنا بڑی حد تک پڑھنے پر منحصر ہے اور جو کچھ ہم پڑھیں اس سے صحیح نتیجے اخذ کرنے اس کی اہمیت کا اندازہ کرنے اور اسے یاد رکھ کر اس سے حسبِ موقع اور حسبِ ضرورت کام لینے کی صلاحیت پیدا کریں۔یہی چیز ہے جس سے انسان معاشرتی زندگی میں کامیابی حاصل کرتا ہے اور معاشرتی زندگی کے علاوہ ذاتی حیثیت سے بھی مطالعہ ہی شخصیت کی نشو ونما کا سبب بنتا ہے۔اس لیے کہ مطالعے ہی سے انسان کے تجربات کی دنیا وسیع ہوتی ہے۔پڑھا لکھا آدمی اپنے ہم شہریوں میں معزز و محترم ہوتا ہے اور یہ چیز ایسی ہے جس کا محتاج ہر چھوٹا بڑا ہے۔'' (مطالعے کے بہتر طریقے، صفحہ 11)

سیاسی اور ادبی مضامین کے تراجم کے حوالے سے وقار عظیم صاحب لکھتے ہیں: ''مضامین کے ترجمے میں بعض اوقات ایسے ٹکڑے حذف کر دیے گئے ہیں جن میں سیاسی عقائد کا رنگ بہت نمایاں تھا اور اس سے ان کی علمی اور ادبی شان میں کمی سی محسوس ہوتی تھی ......بعض اوقات ان تحریروں میں ایسی

ادبی شان پیدا ہو گئی ہے کہ پڑھنے والا خیالات سے قطع نظر خود عبارت کے حسن اور دل نشینی کی وجہ سے اُنھیں پڑھتا ہے ۔میں نے کوشش کی ہے کہ یہ ادبیت جہاں تک ممکن ہو قائم رہے ......بحیثیت مجموعی ترجمے میں اصل کی روح کو قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔(آزاد تعلیم اور جمہوری نصب العین ۔تعارف)

فلسفۂ ادب اور تنقید کے حوالے سے وقار عظیم صاحب کے کیے ہوئے دو تراجم بہت اہمیت رکھتے ہیں ایک ''امریکی ناول اور اُس کی روایات'' اور دوسرے ''ایمرسن کے مضامین'' ۔دوسرا ترجمہ اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ ہمارے تنقیدی ادب میں بہت سے لکھنے والوں نے پہلی مرتبہ ایمرسن کو اسی حوالے سے جانا ۔کتاب کا موضوع 'شعر' فلسفہ' تصوف' مذہبیات اور ادب سبھی کچھ ہیں ۔ایمرسن اپنے مزاج کے اعتبار سے مغربی کم اور شرقی زیادہ تھا ۔وہ حافظ اور سعدی کا شیدائی تھا ۔بعض لوگوں کے نزدیک شاعر مشرق علامہ اقبال اور اُس کی سوچ میں بھی بہت مماثلت پائی جاتی ہے ۔دونوں کے نزدیک وجدان کی فکر کے حوالے سے بے حد اہمیت ہے ۔اسی طرح دونوں نے تنگ نظر علما کو چاہے وہ کسی بھی مذہب سے ہوں اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے ۔''امریکی ناول اور اس کی روایات'' خالصتاً تنقیدی کتاب ہے جس کا موضوع امریکی ناول نگاری کی تاریخ اور فنی ارتقا ہے ۔کتاب اور اس کے ترجمے پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مبصر نے لکھا ہے:''ناول کی تنقید سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب بڑی گراں قدر ہے اور ترجمہ کے حسن وصحت کی ضمانت پروفیسر سید وقار عظیم صاحب کا نام ہے ۔''

وقار عظیم صاحب کے کیے ہوئے سبھی ترجموں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اُنھوں نے دوسری زبانوں سے اُردو میں ڈھالتے وقت جہاں اپنی زبان کی صحت اور خوبصورتی کو پیشِ نظر رکھا ہے وہیں اصل کی روح کو بھی ٹھیس نہیں پہنچنے دی ۔ایک اچھے ترجمے کے لیے یہی باتیں سب سے اہم اور ضروری ہیں ۔

وقار عظیم صاحب کی دوسری تحریروں کی طرح اُن کے تراجم میں بھی اُن کے اُسلوب کی یہ خوبی بہت نمایاں ہے کہ کسی اُلجھاؤ کے بغیر بات کہہ جاتے ہیں،یوں پڑھنے والا نفسِ مضمون کے ساتھ ساتھ اُسلوب کی خوبصورتی سے بھی لطف اُٹھاتا ہے ۔

☆☆☆☆

مآخذ

کتب:

1 احتشام حسین، سید، اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان دہلی

2 اختر وقار عظیم، ہم بھی وہیں موجود تھے، سنگ میل لاہور، 2016

3 اختر وقار عظیم، پدرم سلطان بود، سنگ میل لاہور، 2017

4 آلِ احمد سرور، تنقید کیا ہے؟، مکتبہ جامعہ دہلی، 1972

5 اعجاز حسین، ڈاکٹر، مختصر تاریخ ادب اُردو، اُردو اکیڈمی سندھ کراچی، 1971

6 اے حمید، سنگ دوست، جودت پبلی کیشنز لاہور، 1984

7 حامد حسن قادری، داستانِ تاریخ اُردو، اُردو اکیڈمی سندھ کراچی، 1966

8 خواجہ محمد سعید، گورنمنٹ کالج اور میں، الوقار پبلی کیشنز لاہور، 2004

9 شوکت تھانوی، قاعدہ بے قاعدہ، ادارہ فروغ اُردو لاہور

10 صابر لودھی، بھلایا نہ جائے گا، مکتبہ روشن خیال لاہور، 2010

11 عبادت بریلوی، ڈاکٹر، اُردو تنقید کا ارتقاء، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 1986

12 عبادت بریلوی، ڈاکٹر، تنقید اور اُصول تنقید، ادارہ ادب و تنقید لاہور، 1984

13 عبدالشکور احسن، سجاد باقر رضوی، غالب، ذاتی تاثرات کے آئینہ میں مجلسِ یادگارِ غالب، 1969

14 گوپی چند نارنگ، ادبی تنقید اور اُسلوبیات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

15 غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، صد سالہ تاریخ جامعہ پنجاب لاہور، 1962

16 معین الرحمٰن، ڈاکٹر، شخصیات و ادبیات، مکتبۂ عالیہ لاہور، 1995

17 معین الرحمٰن، ڈاکٹر، سید وقار عظیم سوانحی خاکہ، اُردو اکیڈمی سندھ کراچی 1967

18 نسرین اختر، ڈاکٹر، تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج سنگت پبلشر لاہور، 2006

19 وقار عظیم، سید، ہمارے افسانے، سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد، 1935

20 وقار عظیم، سید، فنِ افسانہ نگاری، سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد، 1935

21 وقار عظیم، سید، انتخاب مومن، (مع مقدمہ و تذکرہ)، حالی پبلشنگ ہاؤس، 1942

22 وقار عظیم، سید، انشا کی تعلیم، جامعہ مکتبہ دہلی، 1943

23 وقار عظیم، سید، نیا افسانہ، ساقی بک ڈپو، 1946

24 وقار عظیم، سید، علامہ راشد الخیری (ترتیب مع مقدمہ)، عصمت کتاب گھر دہلی، 1946

25 وقار عظیم، سید، باغ و بہار مع مقدمہ، اُردو مرکز لاہور 1952

26 وقار عظیم، سید، الف لیلیٰ سرشار (انتخاب مع مقدمہ)، کتاب منزل لاہور 1952

27 وقار عظیم، سید، آغا حشر اور اُن کے ڈرامے، اُردو مرکز لاہور 1954

28 وقار عظیم، سید، ہماری داستانیں، فروغ اُردو لاہور، 1956

29 وقار عظیم، سید، اندر سبھا مع شرح، اُردو مرکز لاہور، 1957

30 وقار عظیم، سید، داستان سے افسانے تک، اُردو اکیڈمی سندھ کراچی، 1959

31 وقار عظیم، سید، فردوسِ بریں (ترتیب مع مقدمہ)، مجلس ترقی ادب لاہور، 1962

32 وقار عظیم، سید، نقلیات میر بہادر علی حسینی، مجلس ترقی ادب لاہور 1966

33 وقار عظیم، سید، فن اور فنکار، اُردو مرکز لاہور، 1966

34 وقار عظیم، سید، اقبال شاعر اور فلسفی، مکتبہ عالیہ لاہور 1968

35 وقار عظیم، سید، اقبال معاصرین کی نظر میں، مجلس ترقی ادب لاہور، 1973

36 وقار عظیم، سید، اقبالیات کا مطالعہ، اقبال اکیڈمی لاہور، 1977

37 وقار عظیم، سید، بیتال پچیسی (مظہر علی ولا)، لاہور 1987

38 وقار عظیم، سید، فورٹ ولیم کالج (غیر مطبوعہ تحریریں) مرتب: سید معین الرحمان، ڈاکٹر، یونیورسل بکس لاہور، 1986

39 وقار عظیم، سید، اُردو ڈرامہ فن اور منزلیں (مرتب: سید معین الرحمان، ڈاکٹر) یونیورسل بکس لاہور، 1991

40 وقار عظیم، سید، چند قدیم ڈرامے (تعارف و تجزیہ)، (مرتب: سید معین الرحمان، ڈاکٹر) یونیورسل بکس لاہور، 1991

41 وقار عظیم، سید، اُردو ڈرامہ تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ (سید وقار عظیم کی تحریریں، مرتب: سید معین الرحمان، ڈاکٹر)، الوقار پبلی کیشنز لاہور، 1996

42 وقار عظیم، سید، وقار غالب، (مرتب: سید معین الرحمٰن، ڈاکٹر)، لاہور، 1997

43 وقار عظیم، سید، مثنوی گلزار نسیم مع مقدمہ۔ اُردو مرکز لاہور، س ن

44 وقار عظیم، سید، مثنوی زہر عشق مع مقدمہ، مکتبہ ادب لطیف لاہور، س ن

45 وقار عظیم، سید، مرثیے پر چند تحریریں، الوقار پبلی کیشنز لاہور، 2005

46 وقار عظیم، سید، الحمرا کی داستانیں، آئینہ ادب لاہور، 1959

47 وقار عظیم، سید، آزاد تعلیم اور جمہوری نصب العین، طبع اول: آئینہ ادب لاہور، 1959 آزاد تعلیم اور تہذیب نفس، طبع دوم میں یہ کتاب تبدیل شدہ نام سے شائع ہوئی: آئینہ ادب، لاہور 1963

48 وقار عظیم، سید، مدرسے کی زندگی میں بچے کی رہنمائی: آئینہ ادب لاہور، 1959

49 وقارعظیم،سید،بیماری کے جذباتی اورنفسیاتی پہلو: آئینہ ادب لاہور،1959
50 وقارعظیم،سید،امریکی ناول اوراس کی روایت: آئینہ ادب لاہور،1962
51 وقارعظیم،سید،ایمرسن کے مضامین: آئینہ ادب لاہور،1963
52 وقارعظیم،سید،بچوں کو بہتر بولنا سکھایئے:مقبول اکیڈمی لاہور،1963
53 وقارعظیم،سید،مطالعے کے بہتر طریقے:مقبول اکیڈمی لاہور،1963
54 وقارعظیم،سید،آیئے دوست بن جایئے: آئینہ ادب لاہور،1963

مقالات:

1 ثمرین اختر،سیدوقارعظیم بحیثیت اقبال شناس،نگران،پروفیسر نثاراحمد قریشی،ڈاکٹر،صدر شعبہ اُردو/ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز،(مقالہ برائے ایم فل،اُردو)علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،اسلام آباد،2006
2 ناہید اختر،پروفیسر سیدوقارعظیم بطوراقبال شناس،نگران:سیدمعین الرحمٰن،ڈاکٹر،
(مقالہ برائے ایم اے اُردو)،گورنمنٹ کالج فیصل آباد،1976ء 1978
3 محمدارشدخان،سیدوقارعظیم کی تنقیدی نگاری،نگران:سہیل احمد خان،ڈاکٹر،
(مقالہ برائے ایم اے اُردو)،پنجاب یونیورسٹی،اورینٹل کالج لاہور1982ء،1984
4 روشینہ ریاض،پروفیسروقارعظیم بطورغالب شناس،نگران:سیدمعین الرحمٰن،ڈاکٹر،
(مقالہ برائے ایم اے اُردو)،گورنمنٹ کالج لاہور،1996
5 صفدرعلی۔سیدوقارعظیم۔اُردوافسانوی نثر کی تنقید،نگران،مزمل بھٹی صاحب،ڈاکٹر،
(مقالہ برائے ایم اے اُردو)اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور2011

رسائل:

1 الاقربا،اسلام آباد،جولائی ستمبر 2004
2 الحمرا،لاہور،نومبر 2007
3 الحمرا،لاہور،دسمبر2011
4 تحریر،دہلی،جنوری مارچ1977
5 سیارہ،لاہور،دسمبر1962
6 سیارہ،لاہور،(اشاعت خاص)ستمبر 1965
7 ماہِ نو،لاہور،سیدوقارعظیم نمبر،مئی 1978
8 نصرت،لاہور،11ستمبر 1960
9 نقوش،لاہور،جنوری1977

اخبارات:

1 جسارت کراچی، 18 نومبر 1982
2 جنگ لاہور، 18 نومبر 2001
3 جنگ لاہور، 31 دسمبر 2001
4 مشرق لاہور 17 نومبر 1980
5 نوائے وقت لاہور، 4 نومبر 1980
6 نوائے وقت لاہور، 18 نومبر 1997
7 نوائے وقت لاہور، 24 دسمبر 1997

☆☆☆☆

اکادمی ادبیات پاکستان کی مطبوعات

(پاکستانی ادب کے معمار سیریز کی دیگر کتب)

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	سال اشاعت	قیمت		ریمارکس
				مجلد	غیر مجلد	
1	مولانا صلاح الدین احمد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	1991	120 روپے	-	
2	ساغر صدیقی: شخصیت اور فن	یونس ادیب	1996	-	120 روپے	ختم
3	شاہ حسین: شخصیت اور فن	ڈاکٹر راشد متین/منور نقوی	1998	95 روپے	-	ختم
4	قتیل شفائی: شخصیت اور فن	اے حمید/ڈاکٹر راشد متین	1998	95 روپے	-	ختم
5	اشفاق احمد: شخصیت اور فن	اے حمید/محمد حمید شاہد	1998	95 روپے	-	ختم
6	ابن انشاء: شخصیت اور فن	اے حمید/امجد طفیل	1998	95 روپے	-	ختم
7	ظہیر کاشمیری: شخصیت اور فن	اے حمید/ڈاکٹر راشد متین	1998	95 روپے	-	ختم
8	سرسید احمد خان: شخصیت اور فن	جمیل یوسف	1998	220 روپے	210 روپے	ختم
	اشاعت دوئم	ایضاً	2008	220 روپے	210 روپے	ختم
9	رشید اختر ندوی: شخصیت اور فن	زاہد منیر/ڈاکٹر راشد متین	1999	95 روپے	-	ختم
10	حکیم محمد سعید: شخصیت اور فن	صادق حسین طارق	1999	-	40 روپے	
11	امتیاز علی تاج: شخصیت اور فن	ڈاکٹر گوہر نوشاہی	1999	-	40 روپے	
12	حفیظ جالندھری: شخصیت اور فن	عزیز ملک	2000	-	40 روپے	
13	باقی صدیقی: شخصیت اور فن	پروفیسر نجمی صدیقی	2000	-	40 روپے	
13a	شاعر افغانپوری: حیات و فن	ڈاکٹر نثار ترابی	2004	130 روپے	110 روپے	
13b	سلطان باہو: حیات و فن	شفیع عقیل	2004	110 روپے	90 روپے	ختم
13c	خوشحال خان خٹک: حیات و فن	خدیجہ فیروز الدین/ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک	2005	270 روپے	350 روپے	ختم
14	ڈاکٹر وزیر آغا: شخصیت اور فن	رفیق سندیلوی	2006	130 روپے	125 روپے	ختم
15	میرا جی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر رشید امجد	2006	140 روپے	135 روپے	ختم
16	پطرس بخاری: شخصیت اور فن	عبدالحمید اعظمی	2006	145 روپے	140 روپے	ختم
17	محمد خالد اختر: شخصیت اور فن	اشفاق احمد ورک	2006	150 روپے	145 روپے	
18	ڈاکٹر وحید قریشی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر گوہر نوشاہی	2006	115 روپے	110 روپے	ختم

19	شریف کنجاہی شخصیت اور فن	زاہد حسن	2006	140 روپے	130 روپے	ختم
20	میر گل خان نصیر، شخصیت اور فن	واحد بخش بزدار	2006	150 روپے	140 روپے	
21	فیض احمد فیض، شخصیت اور فن	اشفاق حسین	2006	210 روپے	200 روپے	ختم
	اشاعت دوم	ایضاً	2008	210 روپے	200 روپے	ختم
22	شیخ ایاز شخصیت اور فن	ڈاکٹر فگار ہکڑو	2006	140 روپے	135 روپے	ختم
23	ابوالفضل صدیقی، شخصیت اور فن	نذر الحسن صدیقی	2006	100 روپے	90 روپے	
24	یوسف ظفر، شخصیت اور فن	ڈاکٹر تصدق حسین راجہ	2006	140 روپے	135 روپے	
25	کاکاجی صنوبر، شخصیت اور فن	حنیف خلیل	2006	145 روپے	130 روپے	ختم
26	مرزا قلیچ بیگ شخصیت اور فن	نصیر مرزا	2006	115 روپے	110 روپے	
27	سوبھو گیان چندانی، شخصیت اور فن	سید مظہر جمیل	2006	200 روپے	190 روپے	ختم
	اشاعت دوم	ایضاً	2010	200 روپے	190 روپے	
28	انتظار حسین، شخصیت اور فن	ڈاکٹر آصف فرخی	2006	145 روپے	130 روپے	ختم
29	منیر نیازی، شخصیت اور فن	امجد طفیل	2006	115 روپے	110 روپے	ختم
30	جمال ابڑو شخصیت اور فن	منظور علی ویسریو	2006	120 روپے	110 روپے	
31	عبداللہ جان جمالدینی، شخصیت اور فن	ڈاکٹر شاہ محمد مری	2006	110 روپے	100 روپے	
32	شوکت صدیقی، شخصیت اور فن	ڈاکٹر انوار احمد	2006	100 روپے	90 روپے	
33	سید ہاشمی شخصیت اور فن	پروفیسر صبا دشتیاری	2006	100 روپے	90 روپے	
34	شاہد احمد دہلوی شخصیت اور فن	تاج بیگم فرخی	2006	180 روپے	175 روپے	
35	ادا جعفری، شخصیت اور فن	شاہدہ حسن	2007	120 روپے	115 روپے	ختم
36	اجمل خٹک، شخصیت اور فن	عبداللہ جان عابد	2007	200 روپے	190 روپے	ختم
37	سید وارث شاہ، شخصیت اور فن	حمید اللہ ہاشمی	2007	130 روپے	120 روپے	ختم
38	احمد راہی شخصیت اور فن	ڈاکٹر ناہید شاہد	2007	160 روپے	150 روپے	ختم
39	پروین شاکر شخصیت اور فن	ڈاکٹر سلطانہ بخش	2007	145 روپے	135 روپے	ختم
40	محمد حسن عسکری شخصیت اور فن	عزیز ابن الحسن	2007	155 روپے	140 روپے	
41	جانباز جتوئی، شخصیت اور فن	حمید الفت ملغانی	2007	175 روپے	165 روپے	ختم
42	ڈاکٹر جمیل جالبی، شخصیت اور فن	عبدالعزیز ساحر	2007	160 روپے	150 روپے	ختم
43	رحمان بابا شخصیت اور فن	ڈاکٹر پرویز مہجور خویشکی	2007	185 روپے	175 روپے	
44	عطا شاد، شخصیت اور فن	افضل مراد	2007	165 روپے	155 روپے	
45	قلندر مومند، شخصیت اور فن	پروفیسر محمد زبیر حسرت	2007	175 روپے	165 روپے	
46	امیر حمزہ شنواری شخصیت اور فن	ڈاکٹر قابل خان آفریدی	2007	165 روپے	155 روپے	ختم
47	میاں محمد بخش، شخصیت اور فن	حمید اللہ ہاشمی	2007	165 روپے	155 روپے	ختم
48	ناصر کاظمی، شخصیت اور فن	باصر سلطان کاظمی	2007	200 روپے	190 روپے	ختم
49	ڈاکٹر تنویر عباسی شخصیت اور فن	ڈاکٹر ادل سومرو	2007	176 روپے	166 روپے	
50	مست توکلی، شخصیت اور فن	ڈاکٹر شاہ محمد مری	2007	170 روپے	160 روپے	

51	خواجہ غلام فرید: شخصیت اور فن	ڈاکٹر طاہر تونسوی	2007	185 روپے	175 روپے	ختم
52	مولانا صلاح الدین احمد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	2007	200 روپے	190 روپے	
53	جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر ہلال نقوی	2007	210 روپے	200 روپے	ختم
54	ڈاکٹر نبی بخش بلوچ: شخصیت اور فن	محمد راشد شیخ	2007	165 روپے	155 روپے	
55	ممتاز مفتی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر نجیبہ عارف	2007	190 روپے	180 روپے	ختم
56	شفیق الرحمان: شخصیت اور فن	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	2007	160 روپے	155 روپے	
57	احمد فراز: شخصیت اور فن	محبوب ظفر	2007	220 روپے	210 روپے	ختم
	اشاعت دوم	ایضاً	2016	580 روپے	560 روپے	
58	ڈاکٹر سید عبداللہ: شخصیت اور فن	ڈاکٹر روبینہ شاہین	2007	150 روپے	140 روپے	ختم
59	ضیا جالندھری: شخصیت اور فن	علی محمد فرشی	2008	200 روپے	190 روپے	
60	ممتاز شیریں: شخصیت اور فن	ڈاکٹر تنظیم الفردوس	2008	215 روپے	210 روپے	
61	پروفیسر فتح محمد ملک: شخصیت اور فن	محمد حمید شاہد	2008	195 روپے	185 روپے	
62	سعادت حسن منٹو: شخصیت اور فن	مبین مرزا	2008	220 روپے	210 روپے	
63	پروفیسر احمد علی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر محمد کامران	2008	190 روپے	180 روپے	
64	کرنل محمد خان: شخصیت اور فن	بریگیڈیر (ر) ایم اسماعیل صدیقی	2008	190 روپے	180 روپے	
65	عابد علی عابد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر سلیم اختر	2008	225 روپے	215 روپے	
66	سائیں احمد علی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر ظہور احمد اعوان	2008	170 روپے	160 روپے	
67	فارغ بخاری: شخصیت اور فن	طارق ہاشمی	2008	210 روپے	200 روپے	
68	سچل سرمست: شخصیت اور فن	ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو	2008	150 روپے	140 روپے	ختم
69	شاہ عبداللطیف بھٹائی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر فہمیدہ حسین	2008	170 روپے	160 روپے	ختم
70	دوست محمد کامل مومند: شخصیت اور فن	مصطفیٰ کمال	2008	160 روپے	150 روپے	
71	مسعود مفتی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر مقصود حسین	2008	280 روپے	270 روپے	
72	مجید امجد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر ناصر عباس نیر	2008	170 روپے	160 روپے	
73	بانو قدسیہ: شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	2008	300 روپے	290 روپے	ختم
74	ن م راشد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر ضیاء الحسن	2008	220 روپے	210 روپے	ختم
75	مشتاق احمد یوسفی: شخصیت اور فن	طارق حبیب	2008	260 روپے	250 روپے	ختم
76	رضا ہمدانی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار	2008	240 روپے	230 روپے	
77	ڈاکٹر فقیر محمد فقیر: شخصیت اور فن	محمد جنید اکرم	2008	210 روپے	200 روپے	
78	جمیل الدین عالی: شخصیت اور فن	بیگم رعنا اقبال	2008	210 روپے	200 روپے	
79	زیتون بانو: شخصیت اور فن	یاسمین یوسفزئی	2008	230 روپے	220 روپے	
80	علامہ اقبال: شخصیت اور فن	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	2008	320 روپے	300 روپے	ختم
	ایضاً (سندھی ترجمہ)	مترجم منظور علی ویسریو	2010	450 روپے	430 روپے	
	ایضاً (پشتو ترجمہ)	مترجم ام سعد شفیق	2010	450 روپے	400 روپے	
81	فخر زمان: شخصیت اور فن	ڈاکٹر امجد علی بھٹی	2008	150 روپے	140 روپے	ختم

	اشاعت دوم	ایضاً	2009	180 روپے	170/روپے	
82	کشور ناہید، شخصیت اور فن	ڈاکٹر شاہین مفتی	2008	150 روپے	140/روپے	ختم
83	مخدوم طالب المولیٰ، شخصیت اور فن	سید احمد علی شاہ	2008	190 روپے	180/روپے	ختم
84	عبداللہ حسین، شخصیت اور فن	محمد عاصم بٹ	2008	160 روپے	140/روپے	ختم
	اشاعت دوم	ایضاً	2016	280 روپے	250/روپے	
85	احمد شمیم، شخصیت اور فن	منیرہ شمیم	2008	220 روپے	210/روپے	
86	ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، شخصیت اور فن	شبنم شکیل	2008	-	-	ختم
87	احمد ندیم قاسمی، شخصیت اور فن	ڈاکٹر ناہید قاسمی	2009	390 روپے	380/روپے	
88	حبیب جالب، شخصیت اور فن	سعید پرویز	2009	280 روپے	270/روپے	ختم
	اشاعت دوم	ایضاً	2010	280 روپے	270/روپے	
89	افتخار عارف، شخصیت اور فن	ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر	2009	275	250/روپے	
90	محمد خان ڈیرائی، شخصیت اور فن	آفاق صدیقی	2009	160 روپے	150/روپے	
91	انیس ناگی، شخصیت اور فن	ڈاکٹر شاہین مفتی	2009	250 روپے	230/روپے	ختم
92	علامہ نیاز فتح پوری، شخصیت اور فن	ڈاکٹر عقیلہ شاہین	2009	220 روپے	210/روپے	
93	استاد دامن، شخصیت اور فن	ڈاکٹر امجد علی بھٹی	2009	190 روپے	180/روپے	
94	اقبال ساجد، شخصیت اور فن	ڈاکٹر جواز جعفری	2010	240 روپے	235/روپے	
95	ثمیر النسا جعفری، شخصیت اور فن	ڈاکٹر تنویر جونیجو	2010	230 روپے	220/روپے	
96	عطاء الحق قاسمی، شخصیت اور فن	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	2010	320 روپے	310/روپے	
97	سید آل رضا، شخصیت اور فن	ڈاکٹر سید محسن نقوی	2010	290 روپے	280/روپے	
98	عرش صدیقی، شخصیت اور فن	بیگم نظیر افتخار	2010	220 روپے	210/روپے	
99	حجاب امتیاز علی تاج، شخصیت اور فن	ڈاکٹر غفور شاہ قاسم	2010	240 روپے	230/روپے	
100	خدیجہ مستور، شخصیت اور فن	تاج بیگم قرشی	2010	210 روپے	200/روپے	
101	ڈاکٹر اسلم انصاری، شخصیت اور فن	محمد افتخار شفیع	2010	210 روپے	200/روپے	
102	ڈاکٹر انور سدید، شخصیت اور فن	پروفیسر سجاد نقوی	2010	400 روپے	390/روپے	
103	صہبا اختر، شخصیت اور فن	ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ	2010	250 روپے	240/روپے	
104	غلام ثقلین نقوی، شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	2010	310 روپے	300/روپے	
105	مولوی غلام رسول عالمپوری، شخصیت اور فن	صاحبزادہ مسعود احمد	2010	450 روپے	400/روپے	
106	سلیم احمد، شخصیت اور فن	ڈاکٹر مختار احمد عزمی	2010	225 روپے	200/روپے	
107	امر جلیل، شخصیت اور فن	پروفیسر کے ایس ناگپال	2010	180 روپے	-	ختم
108	فضا یاد، شخصیت اور فن	اسلم سراج الدین	2010	350 روپے	340/روپے	
109	ڈاکٹر رشید امجد، شخصیت اور فن	ڈاکٹر شفیق انجم	2010	210 روپے	200/روپے	
110	پروفیسر غلام جیلانی اصغر، شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	2010	260 روپے	250/روپے	
111	افضل پرویز، شخصیت اور فن	راجہ شکیل انجم	2010	180 روپے	170/روپے	
112	مجنوں گورکھپوری، شخصیت اور فن	جمال نقوی	2010	190 روپے	180/روپے	

113	شیخ سر عبدالقادر: شخصیت اور فن	ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ	2012	260 روپے	250/روپے	
114	شہزاد احمد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر ضیاء الحسن	2012	270 روپے	260/روپے	
115	فرخندہ لودھی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر انور سدید	2012	310 روپے	300/روپے	
116	صوفی شاہ عنایت شہید: شخصیت اور فن	منظور علی ویسریو	2012	210 روپے	200/روپے	
117	بلھے شاہ: شخصیت اور فن	حمید اللہ ہاشمی	2012	260 روپے	250/روپے	
118	ڈاکٹر سلیم اختر: شخصیت اور فن	ڈاکٹر شاہین مفتی	2015	370 روپے	350/روپے	
119	عزیز احمد: شخصیت اور فن	ڈاکٹر اعجاز حنیف	2015	240 روپے	220/روپے	
120	مولانا الطاف حسین حالی: شخصیت اور فن	ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی	2015	330 روپے	320/روپے	
121	سید نصیر شاہ: شخصیت اور فن	ڈاکٹر اسد مصطفیٰ	2016	370 روپے	350/روپے	
122	احمد بشیر: شخصیت اور فن	محمد ضمیر بدر	2016	260 روپے	240/روپے	
123	سید ضمیر جعفری: شخصیت اور فن	ڈاکٹر عرفان اللہ خٹک	2017	280 روپے	260/روپے	
124	حسرت موہانی: شخصیت اور فن	خورشید ربانی	2017	250 روپے	230/روپے	
125	قابل اجمیری: شخصیت اور فن	خالد مصطفیٰ	2017	180 روپے	160/روپے	
126	ولی محمد طوفان: شخصیت اور فن	ڈاکٹر حنیف خلیل	2017	230 روپے	200/روپے	
127	خالدہ حسین: شخصیت اور فن	بی بی امینہ	2017	230 روپے	210/روپے	
128	سید وقار عظیم: شخصیت اور فن	اصغر ندیم سید	2017	220 روپے	200/روپے	

کتب حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے

میر نواز سولنگی

اسسٹنٹ ڈائریکٹر (سیلز اینڈ ایڈورٹائزمنٹ)

اکادمی ادبیات پاکستان، پطرس بخاری روڈ، سیکٹر H-8/1، اسلام آباد۔

فون: 051-9269711

پروفیسر سید وقار عظیم کی یادگار تصویر

پروفیسر سید وقار عظیم کی دورِ نوجوانی کی یادگار تصویر

پروفیسر سید وقار عظیم اہلیہ کے ساتھ تفریحی مقام پر

پروفیسر سید وقار عظیم کی اہلیہ کے ساتھ یادگار تصویر

پروفیسر سید وقار عظیم، سر عبدالقادر کے ساتھ

فیض احمد فیض، پروفیسر سید وقار عظیم اور احمد ندیم قاسمی

ابن انشا، پروفیسر سید وقار عظیم اور اعجاز بٹالوی

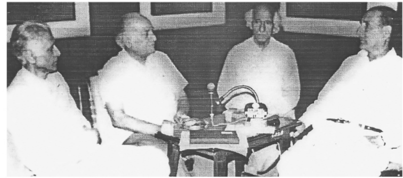
پروفیسر سید وقار عظیم، فضل احمد کریم اور عندلیب شادانی

ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر سید وقار عظیم، ابنِ انشا، اعجاز بٹالوی اور پیر حسام الدین راشدی، چینی وزیر خارجہ اور چینی ادیبوں کے ساتھ

تاج سعید، احمد ندیم قاسمی، فارغ بخاری، فیض احمد فیض، پروفیسر سید وقار عظیم، طفیل ہوشیار پوری



احمد ندیم قاسمی، جگر مراد آبادی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر سید وقار عظیم، ساحر صدیقی، کلیم عثمانی، مکین احسن کلیم، طفیل ہوشیار پوری اور دیگر



ظہیر کاشمیری، صوفی تبسم، فیض احمد فیض اور پروفیسر سید وقار عظیم ریڈیو پروگرام میں



پروفیسر سید وقار عظیم، اعجاز بٹالوی، چینی ادیبوں کے ساتھ



جگر مراد آبادی، پروفیسر سید وقار عظیم اور ابواللیث صدیقی



پروفیسر سید وقار عظیم، بیوی بچوں کے ساتھ



پروفیسر سید وقار عظیم اور شاکر علی



پروفیسر سید وقار عظیم، شہنشاہ نواب اور رالف رسل



اصغر ندیم سید یکم جنوری 1950 کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ ملت ہائی سکول، ملتان سے میٹرک کرنے کے بعد ایمرسن کالج ملتان سے گریجویشن اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ بعدازاں بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی ملتان سے ''سید وقار عظیم: بحیثیت افسانوی ادب کے نقاد'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی۔ اصغر ندیم سید نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ درس و تدریس میں گزارا۔ پانچ سال تک بیکن ہاؤس، نیشنل یونیورسٹی لاہور میں تھیٹر، فلم اور ٹی وی کے شعبے کے سربراہ کی حیثیت سے بھی خدمات سرانجام دیتے رہے۔

اصغر ندیم سید پاکستان کے ادبی منظرنامے پر شاعر، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، کالم نگار اور نقاد کی حیثیت سے اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ ترقی پسند اقدار کی ترویج میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔ جدید نظم کی تحریک میں ان کے انمٹ نقوش ہمیشہ موجود رہیں گے۔ پاکستان کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی فیبرک کو جس طرح انھوں نے سمجھا اور ڈرامے کی صورت میں پیش کیا وہ انھی کا خاصا ہے۔ ان کے مشہور ڈراموں میں: دریا، پیاس، خواہش، نجات، چاند گرہن، ہوائیں، غلام گردش، خدا زمین سے گیا نہیں ہے اور بول میری مچھلی شامل ہے۔ اہم کتابوں میں: ادھوری کلیات، طرز احساس اور کہانی مجھے ملی شامل ہیں۔

ISBN: 978-969-472-316-7

